محیط

احمد ندیم قاسمی



احمد ندیم قاسمی

مُحیط

اساطیر، لاہور

کتاب	:	محیط (شاعری)
ناشر	:	منصورہ احمد (اساطیر)
کتابت	:	محمد حسین شاہ
سرورق	:	شاہ نواز زیدی
مطبع	:	شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور
تاریخ اشاعت	:	جنوری 2000ء (بیسواں ایڈیشن)
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	300 روپے

اساطیر

میاں چیمبرز، 3- ٹمپل روڈ، لاہور

فون: 6304820

ماسئے٭

کے نام

یہ حُسنِ ذوق، یہ حُسنِ نظر، یہ حُسنِ کلام
ترے ہی حُسنِ تمنّا کا معجزہ ہے تمام

٭ ہم سب بہن بھائی اپنی امّی مرحومہ کو "ماسئے" سے مخاطب کرتے تھے

ترتیب

محیط افگندہ بیروں گوہرم را
چو گرد افشاندہ آہن جوہرم را
(غالب)



خاک پر خلدِ بریں کی باتیں
چاند پر جیسے زمیں کی باتیں

دل سے اِک شمع جبیں کی باتیں
اُسی محفل میں وہیں کی باتیں

لبِ دشمن کو بھی شیریں کر دیں
اس کے حسنِ نمکیں کی باتیں

وہم سے بوقلموں کون و مکاں
ورنہ یک رنگ، یقیں کی باتیں

دل کا پتھر نہ کسی سے پگھلا
لوگ کرتے رہے دیں کی باتیں

میرے ناقد! مرا موضوعِ سخن
یہی دنیا ہے، یہیں کی باتیں

۱۹۶۲ء



بے وفا وقت نہ تیرا ہے، نہ میرا ہوگا
رات بھی آئے گی، سورج کا بھی پھیرا ہوگا

میں تو اس سوچ میں گم ہوں کہ ہنسوں یا رو دوں
شب نے لی آخری ہچکی تو سویرا ہوگا

تم حقیقت سے جو ڈرتے ہو تو دن کے باوصف
بند کر لو اگر آنکھیں تو اندھیرا ہوگا

شاید اس دکھ سے اُجڑتی چلی جاتی ہے زمیں
اب تو انساں کا ستاروں پہ بسیرا ہوگا

کتنی شدت پہ ہے، زنداں میں، مری غیرتِ فن
یہ وہ جنگل ہے جو جل کر بھی گھنیرا ہوگا

۱۹۶۲ء



عام ہو جائے نہ اس پیکرِ مے فام کا نام
گردشِ چشم کو دُوں گردشِ ایّام کا نام

نام بدنام ہے نکہت کا، مگر موجِ صبا
جپ رہی ہے مرے محبوبِ گُل اندام کا نام

وصل کے بعد کی تنہائی بھی اک دُنیا ہے
لوگ آغاز کو دے دیتے ہیں انجام کا نام

شب نہ کٹتی تو نئی آگ نہ جلتی دل میں
صبح کی ساری شرارت ہے مگر شام کا نام

دل کی چیخوں میں سُنائی نہیں دیتا کچھ بھی
شبِ خاموش ہے شاید اسی کہرام کا نام

آسماں کچھ بھی نہیں عجزِ بصارت کے سوا
نارسائی ہے محبت کی — لبِ بام کا نام

کتنے معصوم ہیں انساں، کہ بہل جاتے ہیں
اپنی کوتاہی کو دے کر غم و آلام کا نام

ایک لمحے کو رُکا ہوں تو افق پھیل گیا
اب تو مر کر بھی نہ لوں گا کبھی آرام کا نام

یوں مسلماں تو بہت ہیں، مگر اب تک نہ سُنا
اِک مسلماں سے بھی اک پیروِ اسلام کا نام

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ ندیمؔ
میرا کردار کا کردار ہے — اور نام کا نام

۱۹۶۲ء

○

دشت میں ساتھ چلے تو ہزاروں، جو بھی چلا بیگانہ چلا
قصدِ چمن جب میں نے کیا تو میرے جلو میں زمانہ چلا

اس کی قبا بھی نقابِ صنم تھی، میرے گریباں کی مانند
اسی لیے تو شیخِ حرم سے اپنا بہت یارانہ چلا

عشق نہ تھا تو نکتہ بہ نکتہ بات سے بات نکلتی تھی
عشق ہُوا تو آخری دم تک ایک بھی افسانہ نہ چلا

عشق کی رسمِ بے سامانی اپنی سمجھ میں خاک آتی
جب بھی چلا میں سُوئے گلستاں، ساتھ مرے ویرانہ چلا

دل کی آزادی کے بدلے، میں کیوں لیتا حور و قصور
میری مملکتِ غیرت میں یہ کھوٹا سکّہ نہ چلا

دسمبر ۱۹۶۲ء

ہوا

ہوا کی بات سنائی نہ دے سکی سب کو
کسے خبر کہ یہ درماندۂ بساطِ حیات
جو دشت گرد بھی ہے اور چمن نورد بھی ہے
کہاں سے چل کے۔ کدھر سے گزر کے آئی ہے
قبا میں کتنے زمانے سمیٹ لائی ہے

ہوا کی بات سُنائی تو دے۔ مگر احباب
کہاں سے لائیں وہ لمحے جو گزریں تھم تھم کر
کہ لمحے، تنکے ہیں سیلِ ہوا میں الجھے ہوئے
اگر یہ سیل کسی غار میں اُتر جائے
تو لمحہ لمحہ بکھر جائے، وقت مر جائے

فروری ۱۹۶۳ء



گو میں سکوں کی خاطر اترا ہوں آسماں سے
تکمیل پا رہا ہوں، آلامِ جاوداں سے

ٹھن جائے کس بلا کی، یزدان و اہرمن میں
انساں اگر کسی دن ہٹ جائے درمیاں سے

لفظوں کے سینے شق ہیں، معنی عرق عرق ہیں
میں نے کتابِ ہستی کھولی جہاں جہاں سے

ہر قوم کا تمدن، لیتا ہے رنگ و نکہت
کچھ یادِ رفتگاں سے، کچھ جلوۂ بتاں سے

اُونچے شجر ہوں تیرے، یا پیڑ گھر میں میرے
آندھی چلی تو پتے ٹوٹے کہاں کہاں سے!

اپریل ۱۹۶۳ء

دُوسرا رُخ

جھونکا گلی کے موڑ سے نکلا، تو دفعتہً
پیپل کی ایک شاخ کے پتّے اُلٹ گئے
پتّوں کو سامنے سے تو دیکھا ہزار بار
لیکن اس انقلاب کی مجھ کو خبر نہ تھی

اِک رُخ سے دیکھیے تو فقط ایک رنگ ہے
لیکن اک اور رنگ بھی ہے ماورائے رنگ
جس کا سراغ صرف اُنھی کو مِلا، جنھیں
موجِ ہوا کے دستِ رسا کا شعور ہے

انسان ہو، خدا ہو، حقیقت ہو یا گماں
محسوس ہو رہا ہے کہ اک رخ پہ ہیں رواں
لیکن ہوا کی زد میں جب آتی ہے اُن کی ذات
اک اور رُخ پہ گھومنے لگتی ہے کائنات

اپریل ۱۹۶۳ء

○

مجھ سے کافر کو ترے عشق نے یوں شرمایا
دل تجھے دیکھ کے دھڑکا تو خدا یاد آیا

میرے دل پر تو ہے اب تک ترے غم کا سایہ
لوگ کہتے ہیں نیا دور نئے دُکھ لایا

میرا معیارِ وفا ہی مری مجبوری ہے
رُخ بدل کر بھی تجھے اپنے مقابل پایا

چارہ گر، آج ستاروں کی قسم کھا کے بتا
کس نے انساں کو تبسّم کے لیے ترسایا

نذر کرتا رہا میں پھول سے جذبات اسے
جس نے پتّھر کے کھلونوں سے مجھے بہلایا

گھنے اشجار میں اُلجھے رہے کاکلِ شب کے
چاند نے دستِ تجلّی تو بہت پھیلایا

لوگ ہنستے ہیں تو اِس سوچ میں کھو جاتا ہوں
موجِ سیلاب نے پھر کس کا گھروندا ڈھایا

اُس کے اندر کوئی فن کار چھپا بیٹھا ہے
جانتے بوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا

مئی ۱۹۶۳ء



آج تک حسن کا معیار ہے عشق آزاری
کوئی کرتا ہی نہیں تجربۂ دل داری

آدمی اپنی ہی آواز سے ڈر جاتا ہے
اِس قیامت کی خموشی ہے فضا پر طاری

لوگ اب عشق بھی کرتے ہیں بڑی عقل کے ساتھ
اب تو پتھر سے بھی تو لو، تو کلی ہے بھاری

نہ اُٹھے روح سے جب ہُوک، تو کس کام کا درد
یوں بظاہر تو سبھی زخم لگے ہیں کاری

اپنی آنکھوں کے سمندر کا تموّج بھی دِکھا
تُو نے پلکیں تو اُٹھائی ہیں بہ صد دشواری

کتنے افسانے سنائے تری خاموشی نے
اِس بلاغت پہ ہو قرباں مری خوش گفتاری

عام سے تیرے خد و خال کہیں مل نہ سکے
یوں تو دیکھی ہیں کئی صورتیں پیاری پیاری

اِک پجاری کی طرح فن کی پرستش کی ہے
اسی باعث مرے معیار نہیں بازاری

جولائی ۱۹۶۳ء

معیار

شاعر اب تک تو یہ کہتا تھا، کہ میرا محبوب
کچھ اس انداز سے چپ چاپ مرے پاس آیا
جیسے پھولوں پہ اُترتی ہے سبک پا شبنم

لیکن اس دور کو، کیا جانیے، کیا روگ لگا
اب تو محبوب کی آمد بھی نہیں حشر سے کم
ایک اِک سانس میں ہیں کتنے چھناکے برپا

اب تو مس کرتی ہے جب اوس، عذارِ گل سے
ایسی آواز سے گونج اُٹھتی ہے گلشن کی فضا
جیسے جلتے ہُوئے جنگل پہ برس جائے گھٹا

فن کے معیار بدلتے تو ہیں، لیکن اب کے
اس قدر شور ہے کیوں! اے مرے خاموش خدا!

نومبر ۱۹۶۳ء

اشعار

زندگی حسن ہے، رعنائی ہے، دلداری ہے
یہ حقیقت مرے خوابوں کی طرح پیاری ہے

اتنی مدت میں تو کلیاں بھی نہیں مرجھاتیں
اِدھر آئے ہو، اُدھر کوچ کی تیاری ہے

شب کٹی ہے تو سحر کو کوئی سورج بھی ملے
کتنے برسوں سے گجر دم کا سماں طاری ہے

نومبر
۱۹۶۳ء



تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں
حسنِ یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں

تُو نے یوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن، ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانۂ جاں میں، ترے غم کے دم سے
پھول کھلتے نظر آتے ہیں، جہاں تک دیکھوں

وقت نے ذہن میں دھندلا دیے تیرے خد و خال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

اِک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

۱۹۶۳ء



تو بعنوانِ حیا یاد آیا — شعلہ در برگِ حنا یاد آیا
چاندنی تھی کہ تری یاد کا نُور — چاند ڈوبا تو خدا یاد آیا
دیکھتے دیکھتے تارا ٹوٹا — تیرا پیمانِ وفا یاد آیا
دشت میں، موجِ شمیمِ گُل سے — تو جو یاد آیا، بجا یاد آیا
قوسِ محرابِ حرم کے صدقے — خطِ خمدارِ قبا یاد آیا
اس عبادت کی بلاغت کے نثار — مجھے مرقد کا دیا یاد آیا
وقت نشتر بھی ہے، مرہم ہی نہیں — کل سے تُو آج سوا یاد آیا
دیکھ کر قبر سے اُگتا ہوا پھول — اپنا معیارِ بقا یاد آیا

یوں تو یادوں کا مرکب ہوں ندیمؔ
وہ مجھے سب سے جُدا یاد آیا

۱۹۶۳ء



ہوائے دشت میں کیفیتِ بہار بھی ہے
کہ دردِ ہجر میں شاملِ جمالِ یار بھی ہے

شمیمِ گُل کی ہے تجسیم تیرا پیکرِ ناز
تو راز ہے، مگر آنکھوں پہ آشکار بھی ہے

غمِ حیات غمِ عشق ہی سہی لیکن
کہیں تہوں میں چھپا دردِ روزگار بھی ہے

پلٹ چلے ہیں مسافر جوارِ منزل سے
کہ انتہائے رسائی مقامِ دار بھی ہے

میں اس کو پا نہ سکا اور پھر بھی زندہ رہا
ندیمؔ، جبر میں شامل یہ اختیار بھی ہے

۱۹۶۳ء

پتھر

ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لا دوں
میں ترے سامنے انبار لگا دوں — لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا؟

سُرخ پتھر؟ جسے دل کہتی ہے بے دل دُنیا
یا وہ پتھرائی ہُوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں کے تحیّر کے پڑے ہوں ڈورے؟

کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی؟
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے

اک وہ پتھر ہے، جسے کہتے ہیں تہذیبِ سفید
اس کے مرمر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے
ایک اِنصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے، مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے

جتنے معیار ہیں اِس دَور کے، سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اِس دور کے، سب پتھر ہیں

شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام، ترا ذہنِ رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے، میری زباں پتھر ہے
ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار

دسمبر ۱۹۶۳ء

جنگل

اب کے مخدوش نہیں ہے جنگل
شیر غاروں میں پڑے اونگھتے ہیں
اور ہر غار کے منہ پر ہے چٹان
ان چٹانوں سے ذرا سا ہٹ کر
سنگ و فولاد کے ابھرے ہیں مچان
ان مچانوں پہ چڑھے بیٹھے ہیں
گھنے جنگل کے کئی پشتیبان
کوئی ساونت ہے، کوئی بلوان

آہٹیں چار طرف سونگھتے ہیں
پتّہ کھڑکے تو سنبھل جاتے ہیں
جھونکا شاخوں سے اگر بات کرے
رنگ چہروں کے بدل جاتے ہیں
کوئی چڑیا بھی اگر بول پڑے
ان کے ہتھیار مچل جاتے ہیں
تیر چٹکی سے نکل جاتے ہیں
یہ ہے وہ موڑ جہاں آتے ہی
بھول جاتے ہیں برسنا بادل
آنچ آ جائے نہ ظلمت پہ کہیں
اپنے سینے میں چھپا لے مشعل
وقت کی طرح گزر جا چپ چاپ
یوں سمجھ لے کہ ترے پاؤں ہیں شل
سانس کو روک کے چل، سر کے بل
اب کے مخدوش نہیں ہے جنگل

دسمبر ۱۹۶۲ء



ذہنوں میں خیال جل رہے ہیں — سوچوں کے الاؤ سے لگے ہیں
دنیا کی گرفت میں ہیں سائے — ہم اپنا وجود ڈھونڈتے ہیں
اب بھوک سے کوئی کیا مرے گا — منڈی میں ضمیر بک رہے ہیں
ماضی میں تو صرف دل دُکھے تھے — اِس دَور میں ذہن بھی دکھے ہیں
سر کاٹتے تھے کبھی شہنشہ — اب لوگ زبان کاٹتے ہیں
ہم کیسے چھڑائیں شب سے دامن — دن نکلا تو سائے چل پڑے ہیں
لاشوں کے ہجوم میں بھی ہنس دیں — اب ایسے بھی حوصلے کسے ہیں

شکوہ ہے انھیں، کہ ہم قلمکار — آزاد ہیں اور رو رہے ہیں
رونا عادت نہیں ہماری — ہم روتے ہیں جب بھی سوچتے ہیں
ہم سوچتے ہیں کہ یہ مسافر — تاروں کو جو نوچنے چلے ہیں

کہسار کی چوٹیوں سے بچ کر — پاتال میں کیوں اُتر گئے ہیں
ہم روتے ہیں جب تو درحقیقت — تاریخ نگار چونکتے ہیں
ہم لوگ تو ان کے راستوں پر — اشکوں کے دیے جلا رہے ہیں
ہم لوگ تو اپنے آنسوؤں سے — تہذیب کی فصل سینچتے ہیں

برسوں کے سپاٹ افق پہ اب تو — بادل عجب آن سے اُٹھے ہیں
کچھ ایسی گرج اُمڈ رہی ہے — جس طرح پہاڑ پس گئے ہیں
کچھ ایسے لپک رہے ہیں کوندے — خنجر سے فضا میں اُڑ رہے ہیں
اس رنگ سے چل رہے ہیں جھونکے — جیسے کچھ ڈھونڈنے چلے ہیں
ہر چیز کی آنکھ کھل گئی ہے — ہر شے کے حواس جاگتے ہیں
کاندھوں پہ رکھے ہُوئے کدالیں — میداں میں کسان آ گئے ہیں

کچھ روز میں دیکھ لے گی دنیا
پانی میں پہاڑ اُگ رہے ہیں

جولائی
۱۹۶۴ء



ہر لمحہ اگر گریز پا ہے — تُو کیوں مرے دل میں بس گیا ہے
چلمن میں گلاب کھِل رہا ہے — یہ تُو ہے کہ شوخیِ صبا ہے
میں نے تجھے دیکھا جب سے پیارے — ہر چیز پہ پیار آ رہا ہے
جھکتی نظریں بتا رہی ہیں — میرے لیے تُو بھی سوچتا ہے
میں تیرے کہے سے چپ ہوں لیکن — چپ بھی تو بیانِ مدعا ہے
ہر دیس کی اپنی اپنی بولی — صحرا کا سکوت بھی صدا ہے
اک عمر کے بعد مسکرا کر — تُو نے تو مجھے رُلا دیا ہے
اُس وقت کا مَیں حساب کیا دوں — جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے
ماضی کی سناؤں کیا کہانی — لمحہ لمحہ گزر گیا ہے
مت مانگ دعائیں جب محبت — تیرا میرا معاملہ ہے
کس دل سے کروں وداع تجھ کو — ٹوٹا جو ستارہ، جل بجھا ہے
اب تجھ سے جو ربط ہے تو اتنا — تیرا ہی خدا مرا خدا ہے
رونے کو اب اشک بھی نہیں ہیں — یا عشق کو صبر آ گیا ہے
اب کس کی تلاش میں ہیں جھونکے — میں نے تو دیا بجھا دیا ہے

کچھ کھیل نہیں ہے عشق کرنا
یہ زندگی بھر کا رت جگا ہے

دسمبر ۱۹۶۲ء
مارچ ۱۹۶۴ء



جو اپنی جڑوں کو کاٹتا ہے — پندار کا درس دے رہا ہے
اس دور سے کیا وفا کی اُمید — کیوں دن کو چراغ جل رہا ہے
میرے ہی نقوشِ پا سجا کر — صحرا مرا نام پوچھتا ہے
نکلا ہے یہ صبح کا ستارہ — یا رات کی قبر کا دیا ہے
آدم سے ابھی ہے جنگ جاری — صدیوں سے فلک تنا کھڑا ہے

اے نغمہ گرانِ عصرِ حاضر — آغوشِ خیال کب سے وا ہے
جب دل ہو رہینِ طاقِ نسیاں — سر اپنے مدار سے جدا ہے

مٹی سے اگر بنا تھا آدم
انسان تو پیار سے بنا ہے

دسمبر ۱۹۶۲ء
مارچ ۱۹۶۴ء

لمحے اور صدیاں

ملاقات کے چند لمحے
فقط چند لمحے نہ تھے
چند صدیاں تھیں
جن میں محبت کی تاریخ ترتیب پاتی رہی

تو نے پہلے تو اک اجنبی کی سی حیرت سے
پھر ایک دل دوز اپنائیت سے
مری سمت دیکھا
تو لمحوں کے پر جھڑ گئے
تیری زلفوں کی زنجیر سارے بدن پر سجائے ہُوئے

وقت گڑ سا گیا
چند لمحے جو صدیوں کی مانند پھیلے
تو میں نے سُنی
باغِ جنت سے حوّا و آدم کے رختِ سفر باندھنے کی صدا
اور پھر وہ پُراسرار آواز
جس سے خلاؤں کو لبریز ہونا ہے
جب یہ زمیں — چاند سے
چاند — سورج سے
سورج — کسی اور سُورج سے ٹکرائے گا

یہاں سے وہاں تک
زمیں سے زماں تک
مجھے تیری آنکھیں نظر آ رہی تھیں
سمندر تلاطم میں تھے

اور لہریں مرے دل کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں

ابھی تیری آنکھوں سے مانوس ہونے میں کچھ دیر تھی
جب ترے لب ہلے
پھر افق تا افق
پھول ہی پھول تھے
تیری باتوں کی مہکار تھی
تیرے لہجے میں کلیاں چٹکنے کی جھنکار تھی

پھر اک دم، ترا حسن میرے لہو میں اُترنے لگا
زندگی پر مجھے
ایک مدت کے بعد
آخری بار
پیار آگیا

اور پھر میں نے دیکھا
کہ میں تو ازل سے تجھے جانتا ہوں

خدا جانے پھر کیا ہُوا
چند صدیاں گزرنے کے بعد
اب خدا کے سوا کون جانے
کہ پھر کیا ہُوا
تیری آنکھوں کی، تیرے لبوں کی قسم
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں
کہ تجھ سے ملاقات کے چند لمحے
فقط چند لمحے نہ تھے
چند صدیاں تھیں
جو چند لمحوں میں گزریں

اپریل ۱۹۶۴ء



یہ دوپہر، یہ خموشی کے لب پہ سائیں سائیں
چلو، حیات کی اِس قبر پر چراغ جلائیں

وہ حشر ہے کہ کسی کو بھی اپنا گھر نہیں ملتا
کسی نے راستہ پوچھا تو رو پڑیں گی ہوائیں

الٰہی، اب کوئی آندھی عطا ہو صحراؤں کو
سمندروں پہ تو گھِر کر برس گئی ہیں گھٹائیں

یہ سادگی ہے کہ درد آشناؤں کی پُرکاری
مری خوشی کے لیے میرے غم کی قسمیں کھائیں

اک ایسا وقت بھی آتا ہے طولِ ہجر کے ہاتھوں
دل اُن کو یاد کیے جائے، اور وہ یاد نہ آئیں

اب انتظار کی شدّت میں نیند آنے لگی ہے
کہیں فراق کی سب اُلجھنیں سلجھ ہی نہ جائیں

اب اس سے بڑھ کے بھی معراجِ نارسائی کیا ہو
مجھے گلے سے لگائیں مگر سمجھ میں نہ آئیں

اُنھیں دلوں کے عجائب گھروں میں لا کے سجا دو
قدیم عہد کے آثار بن چکی ہیں وفائیں

ندیمؔ، میں کبھی اظہارِ مدّعا نہ کروں گا
مگر وہ، بہرِ خدا، یہ غزل تو سنتے جائیں

اپریل ۱۹۶۴ء



یوں تو سب پھول کھلے سائے میں تلواروں کے
نکہتِ گل سے بھرم کھل گئے گلزاروں کے

میں جسے رات سمجھتا رہا، وہ رات نہ تھی
ساری دنیا پہ تھے سائے تری دیواروں کے

جب سے یاروں نے محبت کو تجارت سمجھا
گھر جو گلیوں میں ہیں، در بن گئے بازاروں کے

یوں تو اک سر پہ بڑی شان سے دستار بندھی
لیکن اس طرح کھلے بل کئی دستاروں کے

کاش اُس انسان کے آنسو بھی کبھی رُک سکتے
راستے جس نے معین کیے سیاروں کے

میں خلاؤں میں اُڑوں، یا سرِ افلاک ندیم
اپنی دھرتی پہ قدم ہیں مرے معیاروں کے

اپریل ۱۹۶۴ء

مجبوری

خدا سے عقل نہ ملتی، تو کیا پڑی تھی مجھے
کہ اقتدار کی نیت کا تجزیہ کرتا
مجھے جبلتِ پرواز نے خراب کیا
وگرنہ میرا ستاروں سے کیا تعلق تھا
یہ سب گدازِ دل و ذہن کا نتیجہ ہے
کہ عمر بھر میں کسی کے لیے اُداس رہا
خدا نے مجھ کو بصارت اگر نہ دی ہوتی
تو حسن مجھ پہ بھلا اتنے حشر کیوں ڈھاتا
فقط شعورِ تناسب ہے، اور جمال ہے نام
کسی کے لمس کی حسرت ہے، ورنہ عشق ہے کیا

رگوں میں خون کی گرمی کا معجزہ ہے تمام
وگرنہ آدمی پتھر سے مختلف تو نہ تھا

تو میری فکر میں جلتے ہوئے الاؤ تو دیکھ
بُرا نہ مان مری تیز و تند باتوں کا

زباں ملی تو مجھے بولنا پڑا — ورنہ
خدا کی طرح، مَیں تا روزِ حشر، چپ رہتا

جولائی ۱۹۶۴ء

○

اِحساس میں پھول کھل رہے ہیں — پت جھڑ کے عجیب سلسلے ہیں
کچھ ایسی شدید تیرگی ہے — آنکھوں میں ستارے تیرتے ہیں
دیکھیں، تو ہوا جمی ہوئی ہے — سوچیں، تو درخت جھومتے ہیں
سقراط نے زہر پی لیا تھا — ہم نے جینے کے دُکھ سہے ہیں

وہ غم تو ہمیں ہیں جاں سے پیارے — جو غم ترے پیار نے دیے ہیں
ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اُٹھے — پھر تیرے حضور آ گئے ہیں
ہم عکس ہیں ایک دُوسرے کا — چہرے یہ نہیں ہیں، آئینے ہیں

لمحوں کا غبار چھا رہا ہے — یادوں کے چراغ جل رہے ہیں
سورج نے گھنے صنوبروں میں — جالے سے شعاعوں کے بُنے ہیں

یکساں ہیں فراق و وصل دونوں — یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں
پاکر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی — کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

جو دن ترے پیار میں کٹے تھے — ماضی کے کھنڈر بنے کھڑے ہیں
جب تیرا جمال ڈھونڈتے تھے — اب تیرا خیال ڈھونڈتے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور — جب خوش بھی ہوئے تو رو دیے ہیں
لو دل کی خبر بھی، چارہ سازو — دامن کے تو چاک سی لیے ہیں

ہم زندہ ہیں، اے فراق کی رات
پیاری، ترے بال کیوں کھلے ہیں

جولائی
۱۹۶۴ء

محبّت

محبت ایک عجب پیارا پیارا حادثہ ہے
کبھی یہ فخر کہ وہ نرم ہاتھ چھو تو لیا
کبھی یہ فکر کہ بازار سے گزرتے ہوئے
کئی نگاہوں نے اس کا بدن ٹٹولا ہے
وہ میرے سامنے، مانا، کہ مسکرایا ہے
مگر یہ پھول سے لب ایسے منجمد تو نہیں
کہ لاکھ چاہیں مگر مسکرا سکیں نہ کہیں
ابھی جو میں نے سنی تھی غزل نما آواز
وہ جس میں نغمہ بھی تھا، درد بھی تھا حسن بھی تھا
کسی کا نام، کسی کا مزاج پوچھے گی
صبا کی طرح سے بیگانۂ نشیب و فراز
کبھی خرامِ صبا کو کسی نے روکا ہے؟

محبت ایک عجیب اُلجھا اُلجھا تجربہ ہے

کبھی یہ زعم — وہ میرا ہے، صرف میرا ہے
کبھی یہ سوچ، وہ اوروں سے سرگراں تو نہیں
کسی کے پاس، کسی بزم میں، کہیں نہ کہیں
مرے خیال سے بیگانہ، اپنے آپ میں مست
وہ اک مجسمۂ حسن بن کے بیٹھا ہے
وہ میرے ایسے ہزاروں سے روشناس بھی ہے
مگر، نہ جانے، جنوں کا یہ کیسا مرحلہ ہے
کہ اس فریبِ تخیل میں مبتلا ہوں میں
وہ مجھ سے دُور بھی ہے، اور میرے پاس بھی ہے
وہ مجھ کو بھول کے، میرے لیے اُداس بھی ہے
غرض، یہ وہم و یقیں کا عجیب سلسلہ ہے

اگست ۱۹۶۴ء

○

دیارِ یار میں دیدارِ یار ہی نہ ہُوا
کہ مجھ سے حشر تلک انتظار ہی نہ ہُوا
اگر فرشتہ نہیں وہ، تو آدمی بھی نہیں
جو قربِ حسن کا امیدوار ہی نہ ہُوا
بجا کہ ان سے ملا درسِ ترکِ عشق، مگر
کچھ اس طرح کہ مجھے ناگوار ہی نہ ہُوا
اگر فقیہہ نے ٹوکا مجھے، بجا ٹوکا
گناہِ عشق پہ میں شرمسار ہی نہ ہُوا
ابھی بہشت کی تنہائی سے نہیں نکلا
وہ آدمی جسے انساں سے پیار ہی نہ ہُوا
یہ پھول تھے، کہ نقوشِ قدم تھے پت جھڑ کے
مجھے تو ان پہ گمانِ بہار ہی نہ ہُوا
وہ شعر اور تو سب کچھ ہے، صرف شعر نہیں
جو روحِ عصر کا آئینہ دار ہی نہ ہُوا

۱۹۶۴ء

اظہار

تجھے اظہارِ محبت سے اگر نفرت ہے
تو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا

بے نیازی سے، مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تُو نے گھبرا کے مرا نام نہ پوچھا ہوتا

تیرے بس میں تھی اگر مشعلِ جذبات کی لَو
تیرے رخسار میں گلزار نہ بھڑکا ہوتا

یوں تو مجھ سے ہُوئیں صرف آب و ہوا کی باتیں
اپنے ٹوٹے ہُوئے فقروں کو تو پرکھا ہوتا

یونہی بے وجہ ٹھٹکنے کی ضرورت کیا تھی
دمِ رخصت میں اگر یاد نہ آیا ہوتا

تیرا غمّاز بنا خود ترا اندازِ خرام
دل نہ سنبھلا تھا تو قدموں کو سنبھالا ہوتا

اپنے بدلے مری تصویر نظر آجاتی
تُو نے اُس وقت اگر آئنہ دیکھا ہوتا

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جُدا ہونے کا
ورنہ کاجل تری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

۱۹۶۴ء



اذانِ صبح سے شب کا علاج کیا ہوگا
مجھے تو تیرا ہی چہرہ سحر نما ہوگا

اس انتظار میں تکمیلِ کفر ہو نہ سکی
کبھی تو میرا خدا بھی مرا خدا ہوگا

بہار کتنی ہی بے رنگ ہو۔ بہار تو ہے
جو گُل نہیں تو کوئی زخم ہی کھلا ہوگا

وہ تیرگی ہے، کہ راہِ وفا سے پوچھتا ہوں
تجھے تو اپنے مسافر کا کچھ پتا ہوگا

میں آج تیرے تصور میں مسکرا تو دیا
مگر یہ فکر ہے، کس کس کا دل جلا ہوگا

ہے میرے لمس میں اب تک ترے بدن کی مہک
تری جدائی کا حق مجھ سے کیا ادا ہوگا

ترے فراق میں بھی تجھ سے ربط قائم ہے
کہ میری یاد میں تُو بھی تو جاگتا ہوگا

مرے دیار کی مانند، تیرے شہر میں بھی
اُداس رات کا سناٹا رو رہا ہوگا

فضا میں تیر رہے ہوں گے کتنے فق چہرے
افق کی دھار پہ مہتاب کٹ گیا ہوگا

میں کھُل کے رو نہ سکا جب، تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تُو نے کیا کیا ہوگا

جنوری ۱۹۶۵ء

یہ عجب شب ہے

یہ عجب شب ہے، کہ روشن بھی ہے، تاریک بھی ہے
اتنی روشن ہے! کہ دن اس کے مقابل شب ہے
اور تاریک بھی اتنی! کہ ترے دھوکے میں
میں نے چند اور حسیناؤں کے لب چوم لیے
اتنی روشن! کہ ترے پیار کے اُس پار، مجھے
جتنے چہرے نظر آئے، مرے اغیار کے تھے
اتنی تاریک! کہ ان چہروں میں ہر چہرے پر
مجھے خود اپنے ہی چہرے کے گماں گزرے تھے

تو مرے پاس رہا، پھر بھی بہت دور رہا
آج میں نے ترا ایک اور بھی پہلو دیکھا

جنوری ۱۹۶۵ء

○

یوں تمہارا طرزِ محبوبی تو معصومانہ تھا
میرا اندازِ نظر ہی آرزومندانہ تھا
جب بھی سوچا، تم مری حدِ رسائی میں نہیں
حشر تک پھیلا ہُوا تنہائی کا ویرانہ تھا
جس کے پاس آتے ہی دل قندیل بن کر جل اُٹھا
دور رہ کر بھی وہی میرا چراغ خانہ تھا
عشق پر اتنا بگڑنا بھی تو دانائی نہ تھی
قیس کی مانند سارا نجد کیوں دیوانہ تھا
جستجو اتنی بڑھی، سمتوں کو چکّر آ گئے
ہر بگولا اصل میں، پیراہنِ دیوانہ تھا
ساری دنیا جل بجھی، لیکن میں کچھ یوں تھا اداس
بجلیوں کی زد میں جیسے اک مرا کاشانہ تھا
یوں بظاہر سب کے ہونٹوں پر تھی توصیفِ حرم
نیتیں پرکھیں تو ہر انسان اک بُت خانہ تھا

جنوری ۱۹۶۵ء

نیلام

تم میں وہ کون ہے جو یوسفِ کنعاں کے لیے
آخری بولی دے گا؟
سب غلام ایک سے ہوتے تو یہ نیلام بھلا
کس لیے برپا ہوتا
اور یہ یوسفِ کنعاں تو ہے صورت گرِ کونین کا معیارِ جمال

دامن و جیب کو تم سیم و زر و لعل و جواہر
سے تو بھر لائے ہو
وہ مگر اور ہی دولت ہے جو درکار رہے
یوسف کے خریداروں کو
تم اسے کچھ بھی کہو، سوت کی انٹی کہ تہی دستِ محبت کا ملال

جنوری ۱۹۶۵ء

صدائے بے صدا

اظہارِ مدعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اِس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

جب مِل گیا مجھے مری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کنجِ لحد میں بھی میرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء

○

آج کی شب تم نہ آپائے، مگر اچھا ہُوا
چاندنی روئی ہُوئی ہے، چاند ہے ٹوٹا ہُوا

شام کا جادو تھا، یا شدّت تمھاری یاد کا
وقت کیا، مجھ کو تو دریا بھی لگا ٹھہرا ہُوا

جان و تن جلتے ہیں، لیکن ایک کیفیّت کے ساتھ
حسن انگارہ تو ہوتا ہے، مگر پگھلا ہُوا

ہجر کا احساسِ تنہائی ہے بے قیدِ مقام
مجھ کو تو صحنِ چمن بھی دامنِ صحرا ہُوا

جذبۂ تخلیق نے ماتم کی مہلت ہی نہ دی
ہر لُٹے منظر سے اک منظر نیا پیدا ہُوا

وقت کی اپنی طبیعت، عشق کا اپنا مزاج
زندگی پر چھا گیا ہے ایک پَل گزرا ہُوا

آدمی اک تھا، مگر اس کے ہزاروں رُوپ تھے
وہ کبھی بندہ، کبھی آقا، کبھی مولا ہُوا

کیا سوائے موت، کچھ بھی دستِ قدرت میں نہیں
یہ تماشا تو ہے صدیوں سے مرا دیکھا ہُوا

فروری ۱۹۶۵ء

حصارِ فصلِ گُل

(صدرِ پاکستان کے انتخابات کے بعد کراچی کے فسادات کے پس منظر میں)

محصور ہوگئے ہیں عجب فصلِ گُل میں ہم
کلیوں کے دل فگار ہیں، پھولوں کے سر قلم

اک پل میں ہم پر ایک صدی سی گزر گئی
لمحوں سے ناپتے رہے احبابِ طولِ غم

اب حسنِ قدس کس سے کرے منّتِ ردا
اہلِ حرم نے چاک کیا پردۂ حرم

تاروں کا قتل پردۂ شب میں ہُوا، مگر
دستِ سحر سے خون تو ٹپکے گا، صبحدم

چپ چاپ پی گئے ہیں لہو کی پکار کو
دانش وری کے یوں تو بڑے مدعی ہیں ہم

۶ر فروری ۱۹۶۵ء

O

شعور میں، کبھی احساس میں بساؤں اُسے
مگر میں چار طرف بے حجاب پاؤں اُسے

اگرچہ فرطِ حیا سے نظر نہ آؤں اُسے
وہ رُوٹھ جائے تو سو طرح سے مناؤں اُسے

طویل ہجر کا یہ جبر ہے، کہ سوچتا ہوں
جو دل میں بستا ہے، اب ہاتھ بھی لگاؤں اُسے

اُسے بلا کے مِلا عمر بھر کا سناٹا
مگر یہ شوق، کہ اک بار پھر بلاؤں اُسے

اندھیری رات میں جب راستہ نہیں ملتا
میں سوچتا ہوں، کہاں جا کے ڈھونڈ لاؤں اُسے

ابھی تک اس کا تصور تو میرے بس میں ہے
وہ دوست ہے، تو خدا کس لیے بناؤں اُسے

ندیم ترکِ محبت کو ایک عمر ہوئی
میں اب بھی سوچ رہا ہوں، کہ بھول جاؤں اُسے

مارچ ۱۹۶۵ء



ضبط کا عالم جب اِس حد تک نہ و بالا نہ تھا
آگ جلتی تھی، مگر اتنا دھواں اُٹھتا نہ تھا

اب تو تیری یاد بھی آئے، تو گونج اُٹھتا ہے دل
زندگی میں اس قیامت کا سکوں دیکھا نہ تھا

موت آئے گی کہ تُو آئے گا، کچھ ہو گا ضرور
ہجر کی شب، چاند کا چہرہ کبھی ایسا نہ تھا

میرے معیاروں کی دنیا ہی بدل دی عشق نے
اس سے پہلے آدمی اتنا حسیں ہوتا نہ تھا

تیرے ملنے کی خوشی سے اشک تھمتے ہی نہیں
میں کسی پیارے کے مرنے پر بھی یوں رویا نہ تھا

آج تیرا اجنبی لگنا قیامت ہو گیا
میں تو خود اپنے سے بھی بچھڑا تو گھبرایا نہ تھا

تو نے مجھ کو پیار سے دیکھا تو گردش تھم گئی
ایک لمحہ، اتنی صدیوں میں کبھی گزرا نہ تھا

یوں تو جو رنگِ چمن کل تھا، وہی ہے آج بھی
پھول ماضی میں مگر اس کرب سے کھلتا نہ تھا

اب تو کچھ کہنے سے پہلے خون ہو جاتا ہے دل
اِتنی شدت سے تو میں نے آج تک سوچا نہ تھا

یوں تو جو پیدا ہُوا ہے، مر ہی جائے گا، مگر
ہائے وہ دن، موت کا جب اس قدر چرچا نہ تھا

دُھن تو مجھ کو قیس کی سی تھی، مگر اِس دَور میں
پھول اتنے تھے، کہ صحرا کا کوئی رستہ نہ تھا

زندگی میں عمر بھر یوں تو بھنور پڑتے رہے
ڈوب کر دیکھا تو پانی اس قدر گہرا نہ تھا

آنکھ سے آنسو بھی گرتا ہے تو بجتی ہے زمیں
شکر ہے، دل میں تو اس شدت کا سناٹا نہ تھا

غم ادھورا تھا کہ پیغامِ اجل آیا ندیم
بوند ابھی بھڑکی نہ تھی، پتّھر ابھی بولا نہ تھا

جون ۱۹۶۵ء

۶ ستمبر

چاند اُس رات بھی نکلا تھا، مگر اُس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا، جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اُس رات بھی چمکے تھے، مگر اِس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسمِ حسیں، قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اُس رات، مہک پھولوں کی
جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہُوئے بچے کی تلاش
پیڑ چیخ اُٹھتے تھے امواجِ ہوا کی زد میں
نوکِ شمشیر کی مانند تھی جھونکوں کی تراش

اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پہ اُتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اُس رات کی سفاک سپاہ
دودھ پیتے ہُوئے بچوں کو پرو لائی تھی
گھر کے آنگن میں رواں خون تھا گھر والوں کا
اور ہر کھیت پہ شعلوں کی گھٹا چھائی تھی
راستے بند تھے لاشوں سے پٹی گلیوں میں
بھیڑ سی بھیڑ تھی، تنہائی سی تنہائی تھی

تب کراں تا بہ کراں صبح کی آہٹ گونجی
آفتاب ایک دھماکے سے اُفق پر آیا
اب نہ وہ رات کی ہیبت تھی، نہ ظلمت کا وہ ظلم
پرچمِ نور یہاں اور وہاں لہرایا

جتنی کرنیں بھی اندھیرے میں اُتر کر اُبھریں
نوک پر رات کا دامانِ دریدہ پایا
میری تاریخ کا وہ بابِ منوّر ہے یہ دن
جس نے اِس قوم کو خود اُس کا پتہ بتلایا

آخری بار اندھیرے کے پجاری سُن لیں
میں سحر ہوں، میں اُجالا ہوں، حقیقت ہوں میں
میں محبّت کا تو دیتا ہوں محبّت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
امن میں موجۂ نکہت مرا کردار سہی
جنگ کے دور میں غیرت ہوں، حمیّت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں میں

ستمبر
۱۹۶۵ء

کشمیر

ہر گُل کی جبین پُر شکن ہے — کشمیر لُٹا ہُوا چمن ہے
پھولوں نے چھپا رکھا ہے ورنہ — زخموں سے اَٹا ہُوا بدن ہے
ہونٹوں پہ رُکے ہُوئے ہیں شعلے — آنکھوں میں جمی ہُوئی جلن ہے
ہر فرد ہے غم کا اک صحیفہ — ہر چہرہ، حکایتِ محن ہے
پھیلا ہُوا ہاتھ برہمن کا — اس چاند کا مستقل گہن ہے

جلتے ہُوئے گھر، چھنے ہُوئے کھیت
ہر شخص وطن میں بے وطن ہے

سنتے ہیں سمندروں کے اُس پار — اقوام کی ایک انجمن ہے
آج اس کے اصول کے مطابق — ظالم ہے وہی، جو خستہ تن ہے
آج اس کی روایتوں کی رُو سے — رہبر ہے وہی، جو راہزن ہے

آج اس کی بلند مسندوں پر ہر چور کے ہاتھ میں کفن ہے
حق بات تو خیر، جرم تھا ہی حق مانگنا بھی دوانہ پن ہے

سچ کہتی ہیں سب غریب قومیں
یہ بزم بھی بزمِ اہرمن ہے

تاریخ اُلٹ رہی ہے اوراق کشمیر کی برف شعلہ زن ہے
تسلیم — کہ ظالموں کے نزدیک کشمیر دریدہ پیرہن ہے
کشمیر کی مفلسی میں لیکن اب کیسا بلا کا بانکپن ہے
زخموں سے اَٹے ہوئے بدن پر یزداں کا جلال ضوفگن ہے
ہیں برق فشاں، سلے ہوئے لب کاٹا ہوا ہاتھ، تیغ زن ہے
ہر سمت پہاڑ کٹ رہے ہیں ہر فرد شبیہِ کوہ کن ہے
ہر دل میں گڑا ہوا ہے تیشہ لیکن یہی عشق کا چلن ہے

جو موت ہو زندگی کی خاطر
وہ زندگی کا کمالِ فن ہے

ستمبر
۱۹۶۵ء

کارواں بہاروں کا

فضا سے ابر برستا رہا شراروں کا
مگر رواں ہی رہا کارواں بہاروں کا
وہیں سے پھوٹ رہا ہے طلوعِ صبح کا نور
جہاں شہید ہوا اک ہجوم تاروں کا
کھلے ہوئے ہیں جہاں پھول سے نقوشِ قدم
وہیں سے قافلہ گزرا ہے میرے پیاروں کا
رُکے ہوئے ہیں جو دریا، انھیں رُکا نہ سمجھ
کلیجہ کاٹ کے نکلیں گے کوہساروں کا
اسی کو کہتے ہیں تاریخ داں شعورِ وطن
جو آج ایک میں ہے ولولہ ہزاروں کا
مجھے تو پھول کھلانے ہیں، وہ لہو کے سہی
مجھے تو قرض چکانا ہے شاخساروں کا
یہ جی میں ہے کہ شہیدوں کی طرح زندہ ہوں
میں اپنے فن کو بنا لوں دیا مزاروں کا

اکتوبر
۱۹۶۵ء



مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم، کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود، مری رُوح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پر
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تُو مِلا ہے، تو اب سوچتا ہوں، مر جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
میں تیرے در سے جو اُٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بلند
میں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بُت پرست کیوں نہ ہُوا
تجھے قریب جو پاؤں، تو خود سے ڈر جاؤں

کسی چمن میں، بس اِس خوف سے گزر نہ ہُوا
کسی کلی پہ نہ بھُولے سے پاؤں دھر جاؤں

جراحتوں پہ جمی جا رہی ہے وقت کی گرد
ذرا لہو میں نہا لوں تو پھر سنور جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

دسمبر ۱۹۶۵ء



میں وہ شاعر ہوں، جو شاہوں کا ثنا خواں نہ ہُوا
یہ ہے وہ جرم، جو مجھ سے کسی عنواں نہ ہُوا

اس گنہ پر، مری اک عمر اندھیرے میں کٹی
مجھ سے، اس موت کے میلے میں چراغاں نہ ہُوا

کل جہاں پھُول کھِلے، جشن ہے زخموں کا وہاں
دل وہ گلشن ہے، اُجڑ کر بھی جو ویراں نہ ہُوا

آنکھیں کچھ اور دکھاتی ہیں، مگر ذہن کچھ اور
باغ مہکے مگر احساسِ بہاراں نہ ہُوا

یوں تو ہر دَور میں گرتے رہے انسان کے نرخ
ان غلاموں میں کوئی یوسفِ کنعاں نہ ہُوا

میں خود آسودہ ہوں، کم کوش ہوں، یا پتھر ہوں
زخم کھا کر بھی مجھے درد کا عرفاں نہ ہُوا

ساری دنیا متلاطم نظر آتی ہے ندیمؔ
مجھ پہ اک طنز ہُوا، روزنِ زنداں نہ ہُوا

مارچ ۱۹۶۶ء



عمر بھر اُس نے اسی طرح لُبھایا ہے مجھے
وہ جو اِس دشت کے اُس پار سے لایا ہے مجھے

کتنے آئینوں میں اِک عکس دکھایا ہے مجھے
زندگی نے جو اکیلا کبھی پایا ہے مجھے

تُو مرا کفر بھی ہے، تُو مرا ایمان بھی ہے
تُو نے لُوٹا ہے مجھے، تُو نے بسایا ہے مجھے

میں تجھے یاد بھی کرتا ہوں تو جل اُٹھتا ہوں
تُو نے کس درد کے صحرا میں گنوایا ہے مجھے

تُو وہ موتی کہ سمندر میں بھی شعلہ زن تھا
میں وہ آنسو کہ سرِ خاک گرایا ہے مجھے

اتنی خاموش ہے شب، لوگ ڈرے جاتے ہیں
اور میں سوچتا ہوں کس نے بلایا ہے مجھے

میری پہچان تو مشکل تھی، مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے
یہ الگ بات کہ مٹی میں پڑا رُلتا ہوں
یوں تو فن کار نے شہ کار بنایا ہے مجھے
وہی شبنم، جو سرِ گُل تھی، سرِ خار بھی تھی
عمر بھر اک یہی منظر نظر آیا ہے مجھے
اپنا ادراک ہے در اصل خدا کا ادراک
شاید اس خوف نے خود مجھ سے چھپایا ہے مجھے
واعظِ شہر کے نعروں سے تو کیا کُھلتی آنکھ
خود مرے خواب کی ہیبت نے جگایا ہے مجھے
اے خدا، اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تُو نے اِس دَور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

اپریل ۱۹۶۶ء

بیسویں صدی

بات وجدان کی ہوتی تو بڑی بات نہ تھی
کہ رگِ سنگ سے خوشبو کے شرارے جھڑتے
ربط انسان کا افلاک سے اتنا بڑھتا
وہ جب اُٹھتا تو ستاروں پہ بھی سائے پڑتے
اپنے محور پہ زمانے کو گھمانے لگتا
آدمی گردشِ افلاک سے لڑتے لڑتے
کیا خبر تھی کہ اک ایسی بھی گھڑی آئے گی
عقل، وجدان کی باہوں میں سما جائے گی

آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ سورج ہے سیاہ
اس کو اک روز صداقت کا ملے گا انعام
آج کے لوگ، باایں نعرۂ عدل و انصاف
چاند بجھتا ہے تو دھرتے ہیں صبا پر الزام
برف سے آگ ٹپکتی ہے تو شعلے سے نمی
اور کہتے ہیں کہ بدلا نہیں فطرت کا نظام
عقل جو سوچ رہی ہے، وہی وجدان میں ہے
پہلے ممکن جو نہ تھا، اب وہی امکان میں ہے

مئی
۱۹۶۶ء

بھونچال

کرۂ ارض کی مانند ہے انساں کا وجود
سطح پر پھول ہیں، سبزہ ہے، خنک چھاؤں ہے،
برف ہے، چاندنی ہے، رات ہے، خاموشی ہے
اور بادل، جو فضاؤں میں رواں ہیں چپ چاپ
دور سے موتیے کے ڈھیر نظر آتے ہیں
— اور باطن میں گرجتا ہے وہ لاوا، جس سے
زلزلے آتے ہیں، کہسار چٹخ جاتے ہیں
کس کو فرصت ہے کہ اک پل کو ٹھٹک کر سوچے
لبِ دریا جو یہ معصوم سا اک گاؤں سا ہے
اس کے نیچے وہ جہنم ہے، کہ جب جاگے گا
آدمی اپنے ہی پیکر سے نکل بھاگے گا

کرۂ ارض کی مانند ہے انساں کا وجود
کس کو معلوم، کہ رعنائیِ تن کے اُس پار
کون جانے، کہ دمکتے ہوئے عارض سے اُدھر
نکہتِ گیسو و شیرینیِ لب کے پیچھے
حسنِ تہذیب و تمدن سے ذرا سا ہٹ کر
ذہن کی آتشِ سیال میں پڑتے ہیں بھنور
اس کے رستے میں کوئی فلسفہ حائل ہو اگر
قدریں تھرّاتی ہیں، معیار اُلٹ جاتے ہیں
اور اِس زلزلۂ فکر و نظر سے، ہر بار
کتنے دیوانے، روایت سے دغا کرتے ہیں
کتنے بُت ٹوٹتے ہیں، کتنے "خدا" مرتے ہیں

مئی ۱۹۶۶ء



اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے
گل ہیں کمیاب اگر، خون تو ارزاں ہوگا
کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے
آج کے دَور میں انصاف کے معنی یہ ہیں
روح مر جائے، مگر جسم بچایا جائے
آج اَناالحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں
مومنو، دار پہ کس کس کو چڑھایا جائے
نئے انساں سے تعارف جو ہُوا تو بولا
میں ہوں سقراط، مجھے زہر پلایا جائے
مجھ کو دعویٰ تو ہے کانٹوں کو بھی روند آنے کا
اور پھولوں سے بھی دامن نہ چھڑایا جائے

موت سے کس کو مفر ہے، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

یوں بھی ہو سکتی ہے آویزشِ خیر و شر ختم
پھر سے شیطاں کو عزازیل بنایا جائے

کوئی بھی تیرے سوا، مونسِ تنہائی نہ تھا
اک خدا تھا، مگر اُس کو بھی چھپایا جائے

میں محبت کا پجاری ہوں، عقیدوں کا نہیں
اِن بُتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے

کس نے مانگی تھی مرے ترکِ تجسس کی دعا
میرے دشمن کو مرے سامنے لایا جائے

میں قیامت کا تو منکر نہیں لیکن واعظ
مجھ سے انساں کو تماشا نہ بنایا جائے

حکم ہے، سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں، پھول بنایا جائے

جون
۱۹۶۶ء



میری طرح، کسی کو تو اپنا بنا کے دیکھ
میں رو رہا ہوں، تُو بھی ذرا مسکرا کے دیکھ

تُو میرے بازوؤں میں نہیں، میرے دل میں ہے
تُو مجھ سے اتنا دُور نہیں، پاس آ کے دیکھ

میں تیرا کچھ نہیں، مگر اے حسنِ بے نیاز
اپنا درِ ضمیر ذرا کھٹکھٹا کے دیکھ

آخر مَیں کیسے محو کروں دل سے تیری یاد
خورشید کو جبینِ فلک سے مٹا کے دیکھ

تخلیق ہے مری، یہ ترا حسنِ خد و خال
آنکھوں کے آئنے مرے نزدیک لا کے دیکھ

گر میری جستجو ہے، تو میرا پتہ نہ پوچھ
دامانِ دشت سے کوئی ذرّہ اُٹھا کے دیکھ

انجام سب کا ایک سہی راہِ عشق میں
کچھ دیکھنا ہے مجھ میں، تو تیورِ وفا کے دیکھ

تُو بھی اک آفتاب کا خالق ہے، اے جنوں!
چاکِ سحر سے چاکِ گریباں ملا کے دیکھ

ہاتھوں سے خون دُھل نہ سکے گا تمام عمر
دستِ بہار پر سے گُلِ تر اُٹھا کے دیکھ

ہر لفظ میں چھپے ہُوئے چہرے پہ غور کر
اے فن شناس، رنگ بھی میری صدا کے دیکھ

اب رنگ لائے گا ترا دشتِ وفا ندیم
سُن زمزمے ہوا کے، اشارے گھٹا کے دیکھ

جون
۱۹۶۶ء



تو کعبۂ دل میں تھا تو پتھر کا صنم تھا
لیکن مری آغوش میں قندیلِ حرم تھا

جب میں نے پرستش کی حدوں تک تجھے چاہا
پھر جو بھی حسیں تھا، مرے معیار سے کم تھا

انساں کا محبّت بھرا دل تھا مرا مسکن
مشرق تھا نہ مغرب تھا، عرب تھا نہ عجم تھا

جس راز سے انساں کو کئی فلسفے سوجھے
دیکھا تو وہی پھول کی پتّی پہ رقم تھا

ظلمت گہِ حالات کے سنسان افق پر
جو چاند چمکتا ہی رہا، وہ مرا غم تھا

جی کھول کے ہنسنے سے بھی آنسو نکل آئے
کس درجہ مکمل ترا آئینِ ستم تھا

شایانِ شہادت نہ ہُوا کیوں کوئی منصور
یارو، رسن و دار کا ساماں تو بہم تھا

حالاتِ سفر مجھ سے سمٹتے بھی تو کیسے
جو سنگِ لحد تھا، وہ مرا نقشِ قدم تھا

ہر تازہ حقیقت مجھے جس موڑ پہ لائی
تا حدِ نظر دشتِ پُر اسرارِ عدم تھا

اے محتسبو! تم نہ کرو جرم کا اقرار
پیوست مری رُوح میں میرا ہی قلم تھا

جون ۱۹۶۶ء



اس وقت وہ حدّت ہے امانت مرے فن کی
تخلیق ہے جو، دل کے سلگتے ہُوئے بن کی

شعلوں میں جلا ہے کبھی سُولی پہ چڑھا ہے
لت ہے مگر انسان کو بے ساختہ پن کی

میں نے تو پکارا تھا فقط نورِ سحر کو
روزن سے اُتر آئی ہے تلوار کرن کی

دنیا کو تو تج دوں، مگر اے بچھڑے ہُوئے دوست
اس خاک میں خوشبو سی ہے کیوں تیرے بدن کی

جب بھی کوئی لفظ اک نئے مفہوم سے کھنکا
زندانِ سخن میں کوئی زنجیر سی جھنکی

جولائی ۱۹۶۶ء



ہجر کی رات کا انجام تو پیارا نکلا
وہی سورج، کہ جو ڈوبا تھا، دوبارہ نکلا

ظلمتِ شب نے کیا دن کا تصوّر ممکن
یہ اندھیرا تو اُجالے کا سہارا نکلا

تُو، کہ تھا بزم میں تصویرِ کم آمیزی کی
میری تنہائی میں کیوں انجمن آرا نکلا

وقت نے جب بھی مرے ہاتھ سے مشعل چھینی
ذہن میں تیرے تصوّر کا ستارا نکلا

میں ترے قرب سے ڈرتا ہوں کہ تو زندہ رہے
میں سمندر میں جب اُترا تو کنارا نکلا

اپنی ہستی کو مٹانے کا نتیجہ یہ ہے
پھول توڑا تو مرے خون کا دھارا نکلا

نفسی نفسی بھی وہی، سچ کی دُہائی بھی وہی
تیرا محشر، مرا مانوس نظارا نکلا

اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیم
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارا نکلا

اکتوبر ۱۹۶۶ء

وقفہ

راستہ نہیں ملتا
منجمد اندھیرا ہے
پھر بھی باوقار انساں
اس یقیں پہ زندہ ہے
برف کے پگھلنے میں
پو پھٹے کا وقفہ ہے
اس کے بعد سورج کو
کون روک سکتا ہے

دسمبر ۱۹۶۶ء



پھولوں سے تو لد رہی ہے ڈالی — دامن کو نہ دیکھ اے سوالی
یہ میں ہوں کہ سب ہیں آئینے میں — آنکھیں لبریز، ہاتھ خالی
بے مثل سہی خرام تیرا — قدروں کی تو دیکھ پائمالی
گل پر اسے دسترس نہیں کیوں — مٹی کو تو سینچتا ہے مالی

توہینِ گناہ کر رہا ہے — زاہد ہے بلا کا لااُبالی
دوزخ سے ڈرا رہا ہے اس کو — جنت بھی ہے جس کی دیکھی بھالی
فردوس ہیں، اک گنہ کے بدلے — انساں نے کائنات پا لی

شاہانِ زمیں نے بہرِ مرقد — آخر تو مری جگہ نکالی
قبروں پہ لہک رہا ہے سبزہ — اس دشت کی ہر ادا نرالی

پیراہنِ شب نہ جل رہا ہو
مشرق پہ بکھر رہی ہے لالی

دسمبر ۱۹۶۶ء

تقاضے

آج کی رات کے دامن میں ستارے ہیں نہ چاند
آج کی رات تو بے رخصتِ سفر آئی ہے
آج کی رات کا سرمایہ ہیں وہ سناٹے
جن کو تاریکیٔ شب ساتھ لگا لائی ہے
کتنے خاموش ہوئے ہم سفرو! کچھ تو کہو
تم نے کیوں ہونٹ ہلانے کی قسم کھائی ہے

کٹ تو جاتی ہے، مگر رات کی فطرت ہے عجیب
اس کو چپ چاپ جو کاٹو، تو صدی بن جائے
دل میں ہو خوف، تو قطرے پہ ہو قلزم کا گماں
حوصلہ ہو، تو سمندر بھی ندی بن جائے
مشعلیں صرف اندھیرے میں بھلی لگتی ہیں
ورنہ دن کو تو یہ نیکی بھی بدی بن جائے

مارچ ۱۹۶۷ء



سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے
اور سب کہتے ہیں ـ انسان میں کیا رکھا ہے!

یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے
درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

جس کے ہر لفظ سے ہو حشر صداقت پیدا
میں نے وہ گیت قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

کتنا مجبور ہوں میں، حُسنِ نظر کے ہاتھوں
مجھ کو ہر شخص نے دیوانہ بنا رکھا ہے

ہاں، میں خاموش محبت کا بھرم رکھ نہ سکا
ہاں، خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

اور تو کوئی چمکتی ہوئی شے پاس نہ تھی
تیرے وعدے کا دیا راہ میں لا رکھا ہے

لاکھ فرزانگیاں میرے جنوں کے قرباں
میں نے لُٹ کر بھی غمِ عشق بچا رکھا ہے

میری امید کی پتھرا گئیں آنکھیں، لیکن
میں نے اس لاش کو سینے سے لگا رکھا ہے

گھومتی پھرتی ہیں لیلائیں، بگولوں کی طرح
قیس نے دشت میں اک شہر بسا رکھا ہے

حسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیا پھیلیں!
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

مارچ ۱۹۶۷ء



دلوں سے آرزوئے عمرِ جاوداں نہ گئی
کوئی نگاہ، پسِ گردِ کارواں نہ گئی

وہ اور چیز ہے، ہوتے ہیں جس سے دل شاداب
نری بہار سے ویرانیِ خزاں نہ گئی

نکل کے خلد سے بھی آدمی نہ پچھتایا
زمیں پہ بھی چمن آرائیِ گماں نہ گئی

بس ایک کنجِ قفس تک نہ آسکی، ورنہ
صبا چلی تو چمن میں کہاں کہاں نہ گئی

کہاں کہاں نہ ہوئیں ثبت، حسن کی مہریں
کلی ہوا میں بکھر کر بھی رائیگاں نہ گئی

مری دعا کی یہ غیرت ہے کتنی قابلِ داد
لبوں سے نکلی، مگر سوئے آسماں نہ گئی

دیارِ عشق کھنڈر، اور دشتِ دل سنسان
مگر ندیم کی رنگینیِ بیاں نہ گئی!

مارچ ۱۹۶۷ء

کرب

کرب کی آخری حد، ایک نہیں
ایک وہ ہیں جو بنے کرب کی شدت سے بُتِ سنگ نژاد
اور اک وہ ہیں جو اس درجہ ہُوئے نرم وگداز
کہ کوئی قہقہہ مارے تو لرز جائیں
لرز کر رو دیں
کرب کے صید کچھ ایسے بھی ہیں
تلوے سے اگر خار نکالیں تو پکاریں کہ بہار آئی ہے
اور وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں
کہ ہم کرب کا کندن ہیں
ہمیں کرب نے مارا ہے کہ ہم زندہ رہیں

اور اِک میں ہوں
کہ جس کرب سے گزرا ہوں
اسے دوست بنایا ہے
جہاں جاؤں
اسے ساتھ لیے پھرتا ہوں

اپریل ۱۹۶۷ء

ماورائے سماعت

تیرگی جب در و دیوار پہ چھا جاتی ہے
کتنی صدیوں سے مرے کانوں میں
دور سے ایک صدا آتی ہے
اس تسلسل میں کوئی طنز ہے
یا درد ہے
آسیب ہے
یا واہمہ ہے
میں نے داناؤں سے پوچھا تو وہ ڈر کر بولے
"یہ تو آثارِ قیامت ہیں
یہ معمول نہیں قدرت کا!"

کس نے داناؤں سے حق بات سنی ہے
یہ تو وہ لوگ ہیں

جو ظلم کو انصاف بھی کہتے ہیں تو آنکھیں نہیں جھکتیں ان کی
سچ بھی کہتے ہیں تو اُس وقت
کہ جب جھوٹ دغا دے جائے

کس سے پوچھوں
یہ صدا کیا ہے
جو دنیا کی سماعت کی حدوں میں نہیں آئی اب تک
اور راتوں کو مجھے آ کے ستائے
مرے افکار پہ منڈلائے
مری روح کی گہرائی میں اُترے تو سوالوں کا الاؤ سا لگا جائے

یہ آوارہ عناصر کی صدا ہے؟
کہ خدا عظمتِ تخلیق کے غرفے میں کھڑا بول رہا ہے؟
کہ یہ انساں ہے جو سفاکیِ تقدیر پہ مصروفِ بکا ہے؟

اپریل
۱۹۶۷ء

کمالِ دانش

سنا ہے —
ایک ایک ذرّے کے گرد
ایسا ایسا نظامِ گردش رواں دواں ہے
کہ ذہن اس کے رموز پر غور کرتے کرتے
خود ایک گردش میں مبتلا ہے

فضا کا ایک ایک ذرّہ، اک آفتاب ہے
اور کتنے مریخ و مشتری
اَن گنت زمینیں
ہزاروں چاند
اس کے گرد محوِ طواف ہیں

میں زمین پر اک مہین نقطے کی حیثیت میں یہ سوچتا ہوں
کہ اُن زمینوں پہ
ایک ذرّے کے گرد جو اُڑتی پھر رہی ہیں
کوئی تو مخلوق بستی ہوگی
وہاں بھی صبحوں کے اور شاموں کے روپ ہیں
زندگی
مسرّت کے اور اُداسی کے مرحلوں سے گزرتی ہوگی

یہ عصرِ حاضر کی دانش بے پناہ ہے
جس نے میری دنیا کو
ایک کرّے سے ایک ذرّہ بنا دیا ہے

مئی ۱۹۶۷ء

روشنی کی تلاش

(اسرائیل کے ہاتھوں مصر کی شکست اور مصر کے دوستوں کی بے حسی کے پس منظر میں)

اب کہاں جاؤ گے، اے دیدہ ورو؟
اب تو اُس سمت بھی ظلمت ہے
جہاں شب کے الاؤ میں نہا کر
مرے سُورج کو اُبھرنا تھا، گجر بجنے تھے
اب تو مشرق پہ بھی مغرب کا گماں ہوتا ہے
اب تو جب ذکر کرو نورِ سحر کا
تو بِلک اُٹھتی ہے دنیا، کہ کہاں ہوتا ہے!
اب تو اُس شب کی سیاہی نے ہمیں گھیر لیا ہے
کہ جہاں چاند تو کیا، کوئی ستارہ بھی نہیں جی سکتا
اب کہاں جاؤ گے اے دیدہ ورو؟

صرف اِک سمت کے ماتھے پہ لرزتی ہے اُجالے کی لکیر
اور یہ سمت گزرتی ہے ہمارے ہی گھروں اور ہمارے ہی دلوں سے
یہ ہے وہ سمت کہ جس پر مرے ٹیپو کے نقوشِ کفِ پا
چاند تاروں کی طرح روشن ہیں
اور اس سمت سفر کرنے کی یہ شرط ہے
ہم ظلمتِ مغرب کو بتا دیں
کہ ہمیں صبح کے وارث ہیں
کہ ہم مشرق ہیں

جون ۱۹۶۷ء

دُوری

تُو بہت دُور ہے
اور دُوری خدا ہے
مگر تُو خدا تو نہیں ہے
خدا لمس سے ماورا ہے
تجھے میں نے چھو کر بھی دیکھا ہے
باہوں میں لے کر سمیٹا بھی ہے
تجھ کو سوچا بھی ہے اور سمجھا بھی ہے
تُو فقط دُور ہے
تُو خدا کی طرح دُور ہے

میں نے دُوری کے اعجاز دیکھے ہیں
انسان نے دور پا کر خدا کو
اسے اَن گنت دیوتاؤں میں بدلا ہے

پھر اَن گنت بت بنائے ہیں
اُن کے لبوں پر سکوتِ مسلسل کی مُہریں لگائی ہیں
صدیوں کے یخ فرش پر ان بُتوں کی قطاریں سجائی ہیں
اور تُو دھڑکتی ہُوئی زندگی کی حرارت سے لبریز ہے
تیری نس نس میں گاتا لہو دوڑتا ہے
مساموں سے پو پھوٹتی ہے
لبوں پر صدا ہے
بدن رقص کا زاویہ ہے
تُو انساں ہے — یعنی تو رنگ ہے، شاعری ہے، غنا ہے

سُنا ہے کہ انساں اگر دُور جاتے ہیں
پھر لوٹ آتے بھی ہیں
تُو خدا بھی نہیں
دیوتا بھی نہیں
اور اس پر ستم یہ کہ تو لَوٹتا بھی نہیں

جولائی
۱۹۶۷ء

○

کسی کی چاپ نہ تھی، چند خشک پتّے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصلِ گل پہ روئے تھے

ابھی ابھی تمھیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے

تمھارے بعد، چمن پر جب اک نظر ڈالی
کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے

ہم اک نظر کے گنہگار، کیا خدا سے کہیں
تمھی کہو، کہ یہ تم تھے جو دل میں اُترے تھے

تمام عمر وفا کے گناہ گار رہے
یہ اور بات، کہ ہم آدمی تو اچھے تھے

ہمارے ذہن پہ پتھراؤ بے سبب تو نہ تھا
کہ ہم نے تیرہ دلوں سے ستارے مانگے تھے

یہ فخر بھی تو بہت تھا، کہ جو ہنسے ہم پر
وہ کوئی غیر نہیں تھے، تمام اپنے تھے

کسی کا جسم حسیں تھا، کسی کی روح حسیں
غرض یہاں کے سب انسان حسن پارے تھے

شبِ خموش کو تنہائی نے زباں دے دی
پہاڑ گونجتے تھے، دشت سنسناتے تھے

وہ اک ہی بار مرے، جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے، روز مرتے تھے

نئے خیال اب آتے ہیں ڈھل کے آہن میں
ہمارے دل میں کبھی کھیت لہلہاتے تھے

اب ایک شخص جو خوش ہے، فقط وہی خوش ہے
وہ دردمند کہاں، جن میں درد بٹتے تھے

یہ ارتقا کا چلن ہے، کہ ہر زمانے میں
پُرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے

ندیم، جو بھی ملاقات تھی، ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

اگست ۱۹۶۷ء



اب تو شہروں سے خبر آتی ہے دیوانوں کی
کوئی پہچان ہی باقی نہیں ویرانوں کی

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پہ اُٹھائے ہُوئے ایمانوں کی

اپنی پوشاک سے ہشیار! کہ خدّامِ قدیم
دھجیاں مانگتے ہیں اپنے گریبانوں کی

صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں، مگر اس کے ساتھ
سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

دل میں وہ زخم کھِلے ہیں کہ چمن کیا شے ہیں
گھر میں بارات سی اُتری ہُوئی گلدانوں کی

ایک اک یاد کے ہاتھوں میں چراغوں بھرے طشت
کعبۂ دل کی فضا ہے کہ صنم خانوں کی

اُن کو کیا فکر، کہ میں پار لگا، یا ڈوبا
بحث کرتے رہے ساحل پہ جو طوفانوں کی

مقبرے بنتے ہیں زندوں کے مکانوں سے بلند
کس قدر اوج پہ تکریم ہے انسانوں کی

تیری رحمت تو مسلّم ہے، مگر یہ تو بتا
کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز
ابھی دنیا کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

ستمبر ۱۹۶۷ء

قیامت

چلو، اک رات تو گزری
چلو، سفاک ظلمت کے بدن کا ایک ٹکڑا تو کٹا
اور وقت کی بے انتہائی کے سمندر میں
کوئی تابوت گرنے کی صدا آئی

یہ مانا، رات آنکھوں میں کٹی
ایک ایک پل پربت سا بن کر جم گیا
اک سانس لی تو اک صدی کے بعد پھر سے سانس لینے کا خیال آیا
یہ سب سچ ہے کہ رات اک کربِ بے پایاں تھی
لیکن کرب ہی تخلیق ہے
اے پو پھٹے کے دلربا لمحو، گواہی دو

یونہی کٹتی چلی جائیں گی راتیں
اور پھر وہ آفتاب اُبھرے گا
جو اپنی شعاعوں سے ابد کو روشنی بخشے گا
پھر کوئی اندھیرا میری دھرتی کو نہ چھو پائے گا
دانایانِ مذہب کے مطابق، حشر آ جائے گا
لیکن حشر بھی اک کرب ہے
ہر کرب اک تخلیق ہے
اے پو پھٹے کے دلربا لمحو، گواہی دو!

اکتوبر ۱۹۶۷ء

ابدیّت

اب یہاں سے ابدیت کی حدیں دور نہیں
برف ہی برف نظر آتی ہے تا حدِ نظر
کوئی سورج ہے، نہ تارا ہے، نہ پو ہے، نہ شفق
برف کی روشنی ہے، برف کی تاریکی ہے

کیا یہی وہ ابدیت ہے کہ جس کی دُھن میں
ہم نے جذبات و خیالات کی حِدّت کھو دی
اور اب وقت کے اس روضۂ یخ بستہ میں
کچھ بنیں گے تو مجاور ہی بنیں گے ہم لوگ

اکتوبر ۱۹۶۷ء



انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے، تو جھونکا ہوا کا تھا

اس حسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی، وہ تقاضا وفا کا تھا

دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں!
تو سامنے تھا، اور تصوّر خدا کا تھا

چھپ چھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا

اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا

ٹوٹا تو کتنے آئنہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہُوا گلے میں جو پتھّر صدا کا تھا

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

دسمبر
۱۹۶۷ء

حُکم

حکمِ دار لائے ہو ؟
لیکن التجا سن لو
زور سے نہ چلّاؤ
کچھ قریب آ جاؤ
تم کو جو بھی کہنا ہے
تیوروں کو کہنے دو
دبدبے کو رہنے دو

میں کہ ایک شاعر ہوں
نکہتوں کا رکھوالا
نرمیوں کا متوالا
میری یہ تمنا ہے
میری موت یوں آئے
پچھلی رات کو جیسے
ایک تارہ ٹوٹا ہو
ایک تیر چھُوٹا ہو

دسمبر ۱۹۶۷ء

عشق کرو

عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ نہیں شاید ہی ملے

اب سے پہلے کبھی نفرت کے یہ معیار نہ تھے
جنگ کرتے تھے فقط اپنے تحفّظ کے لیے
نوعِ انساں سے تو ہم بر سرِ پیکار نہ تھے
حسن و زیبائیِ عالم سے تو بیزار نہ تھے

وہ بھی کیا دن تھے کہ "تہذیب" ترقی پہ نہ تھی
جب عداوت کے بھی آداب ہُوا کرتے تھے
دل جو بنجر ہیں وہ شاداب ہُوا کرتے تھے

اب تو انسان کچھ اس زور کا جذباتی ہے
جنگ، کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے

اس طرح چاک ہُوا پیرہنِ امن و سکوں
رہنمایانِ سیاست سے یہ شاید ہی سِلے
اپنے فن کار کا اِک بار تو کہنا مانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو

اتنی نفرت بھی نہ بوؤ کہ قیامت کاٹو
عشق کر لو، کہ یہی عشق ہے اب شرطِ بقا
پتھروں نے اسی قوّت سے اُبھارے کہسار
یہی قوّت ہے سمندر، یہی قوّت صحرا
اسی قوّت سے ہے مربُوط ستاروں کا نظام
شاخِ گُل ہے اسی قوّت کے سہارے گلنار
یہی قوّت ہے توازن، یہی قوّت ہے خدا

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسّم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو رُوئے زمیں پر، نہ فضا میں بم بار

لاکھ طوفان اُٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں
عشق چاہے تو شجر کیا، کوئی پتّہ نہ ہلے
آدمیت کا جو منصب ہے، اسے پہچانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو

دسمبر ۱۹۶۷ء



نہ ظلمتِ شب میں کچھ کمی ہے، نہ کوئی آثار ہیں سحر کے
مگر مسافر رواں دواں ہیں، ہتھیلیوں پر چراغ دھر کے

حصارِ دیوار و در سے میں نے نکل کے دیکھا کہ اس جہاں میں
ستارے جب تک چمک رہے ہیں، چراغ روشن ہیں میرے گھر کے

میں دل کا جامِ شکستہ لاؤں کہ روح کی کرچیاں دکھاؤں
میں کس زباں میں تمھیں سناؤں، جو مجھ پہ احساں ہیں شیشہ گر کے

نئی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تاریخ خود لکھے گا
بس اب عجائب گھروں میں رکھ دو قدیم معیار خیر و شر کے

بہشت کی رفعتیں ابھی تک ندیم کے انتظار میں ہیں
کہ اب بھی ذرّے چمک رہے ہیں فلک پہ آدم کی رہگزر کے

جنوری ۱۹۶۸ء



احباب کے حصے میں ہزاروں ہنر آئے
کچھ درد بچے رہ گئے، جو میرے سر آئے

خود اپنے ہی ریزے مری جھولی میں بھرے ہیں
اور لب پہ دعا ہے کہ کوئی شیشہ گر آئے

میں جانتا ہوں، زندہ ہوں جس کرب سے، لیکن
زندہ ہوں کہ شاید کوئی امید بر آئے

مانا کہ ازل سے تری جانب نگراں ہوں
بھیگی ہوئی آنکھوں سے مگر کیا نظر آئے

وہ شعبدۂ حسنِ ادا ہے، کہ خدا ہے
ہر بار مرے پاس برنگِ دگر آئے

جنگل ملے خاموش، تو صحرا ملے تنہا
انداز مرے شہر کے ہر سُو نظر آئے

کہتے ہیں کہ مر کر میں کبھی مر نہ سکوں گا
کیا مر کے ہی جینے کی دعا میں اثر آئے!

اُس حسن کو آغوش میں لینے کا جنوں ہے
جو حسن مجھے حدِ نظر تک نظر آئے

کیا عرش سے آگے بھی کوئی ہے کہ نہیں ہے!
اب تو مجھے خود اپنے خیالوں سے ڈر آئے

گردش سے اگر قطعِ نظر ہو، تو ہے ممکن
ڈوبا تھا جہاں چاند، وہیں سے اُبھر آئے

بہلاؤ نہ اب خلد سے ان خود نگروں کو
غیرت کو بچا کر جو فلک سے اُتر آئے

فروری ۱۹۶۸ء

○

(نذرِ غالب)

اس طرف سے، ترا اک پل کو گزر ہونے تک
اِک بھرے شہر کو دیکھا ہے، کھنڈر ہونے تک

جیسے صحرا میں جدھر جائیے، ریت اُڑتی ہے
عمر نے ساتھ دیا، صرف بسر ہونے تک

رات سے برسرِ پیکار نہیں صرف چراغ
کہ ستارے بھی تو جلتے ہیں، سحر ہونے تک

اے فصیلِ عدم! اے حلقۂ اسرار! ابھی
کتنے سر چاہئیں دیوار کو در ہونے تک

سوچتا ہوں کہ قیامت ہی نہ برپا ہو جائے
تیری رحمت پہ دعاؤں کا اثر ہونے تک

آ ہی جائے گا تجھے حسن کے منصب کا لحاظ
دل شکستہ ہوں ترے آئنہ گر ہونے تک

دھوپ نکلی تو مرا نغمۂ رنگیں سننا
نالہ برلب ہوں میں اعلانِ سحر ہونے تک

مارچ ۱۹۶۸ء

○

کل رات عجیب خواب دیکھا
بجھتا ہوا آفتاب دیکھا

دھجی دھجی تھی دھوپ ساری
ٹکڑے ٹکڑے سحاب دیکھا

کہنے کو تو کائنات دیکھی
اک خیمۂ بے طناب دیکھا

صحرائے حیات سے نکل کر
دیکھا تو وہی سراب دیکھا

سرکا جو ذرا سا پردۂ خیر
ہر جرم کا ارتکاب دیکھا

انسان نے فکر ترک کردی
ایسا بھی اک انقلاب دیکھا

مئی
۱۹۶۸ء

اشعار

خزاں نوخیز، تری یاد میں بسر کر دی
بہار میں بھی نہ مجھ پر فریبِ رنگ چلا

کہی جو میں نے بڑے بھول پن سے سچی بات
اِدھر سے سنگ، تو اُس سمت سے خدنگ چلا

مری حیات کے حالات مختصر یہ ہیں
میں عدل مانگنے آیا تھا اور دنگ چلا

جون ۱۹۶۸ء



میں زندۂ جاوید باندازِ دگر ہوں
بھیگے ہُوئے جنگل میں سُلگتا ہُوا گھر ہوں

ذرّہ ہوں، بظاہر مَیں دکھائی نہیں دیتا
مجھ میں کبھی جھانکو تو میں تا حدِّ نظر ہُوں

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ، سرِ راہگزر ہوں

ظلمت مرا ماحول، تجلّی مری منزل
میں شب کا مسافر ہوں، مگر شمعِ سحر ہوں

بے دَم ہوں، مگر ساتھ نہ چھوڑوں گا تمھارا
تم لوگ مسافر ہو تو مَیں گردِ سفر ہوں

یہ سوچ کے پتّھر مجھے مارو مرے یارو
کچھ بھی ہوں، تمھارا ہی تو میں آئینہ گر ہوں

یارب، مجھے اس کربِ مسلسل سے رہا کر
مسجودِ ملائک ہوں تو کیوں خاک بسر ہوں

قدرت سے ودیعت ہیں مجھے رنگ بھی، رس بھی
ارزاں ہوں، کہ میں شاخِ بریدہ کا ثمر ہوں

جون، جولائی
۱۹۶۸ء



کوہ کاٹیں گے کبھی، دشت کبھی چھانیں گے
ہم تو اے عشق، سدا تیرا کہا مانیں گے

ہم تو خوش ہیں ترے اظہارِ محبت سے، مگر
آئنے اب تری صورت نہیں پہچانیں گے

تُو بھلانا ہمیں چاہے تو بھلا دے، لیکن
تو ہمیں یاد نہ آئے گا تو جب جانیں گے

ہم تو اللہ کے بھی قرب سے بیگانہ ہیں
اجنبی! ہم تجھے کچھ دُور سے پہچانیں گے

عمر بھر جس کے تعاقب میں رہیں گے ہم لوگ
مار ڈالیں گے تو پھر اس کو خدا مانیں گے

یہی تاریخ کے ہر دور کا عنواں ہے ندیمؔ
جو قدم چھُوتے ہیں، نیزے بھی وہی تانیں گے

جولائی ۱۹۶۸ء



چھن گئے تم، تو حسینوں کے یہ میلے کیوں ہیں
بجھ گیا دل، تو اُجالے کے یہ ریلے کیوں ہیں

عشق کا کھیل بھی ہے دوسرے کھیلوں جیسا
مات کا جی میں نہیں حوصلہ، کھیلے کیوں ہیں

اے خداوند! ہر انسان کا جینا، مرنا
تیری منشا ہے، تو پھر اتنے جھمیلے کیوں ہیں

جب کسی شخص کو تقدیر نے کچھ بھی نہ دیا
آج تک سب اسی جلّاد کے چیلے کیوں ہیں

اپنے کاندھوں پہ جنازے لیے اپنے اپنے
ہم کروڑوں ہیں، مگر پھر بھی اکیلے کیوں ہیں

پا بہ زنجیر سہی، چیخ تو سر کر دیتے
ہم نے دُکھ اتنے کڑے صبر سے جھیلے کیوں ہیں

جولائی ۱۹۶۸ء



ہیں میرے قلب و نظر، لعل اور گہر میرے
سمیٹ لیں مرے ریزوں کو شیشہ گر میرے

وہ بول ہوں کہ کہیں نغمہ ہوں، کہیں فریاد
وہ لفظ ہوں کہ معانی ہیں منتشر میرے

مرے نصیب ہیں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنوئیں اُداس مرے، کھیت بے ثمر میرے

خزاں میں ولولۂ پرکشائی کس نے دیا
بہار آئی تو باندھے ہیں کس نے پر میرے

وہ پھول توڑتے ہیں، اور میں خار چنتا ہوں
بچھڑتے جاتے ہیں یوں مجھ سے ہمسفر میرے

عجیب دور ہے! بے غم بھی اور بے حس بھی
کہ میرے درد پہ ہنستے ہیں چارہ گر میرے

جو گل کو دیکھ کے تخلیقِ گُل کا ذکر کیا
تو یہ کھُلا کہ ارادے ہیں پُر خطر میرے

مجھے تلاش ہے اُس عدل گاہ کی جس میں
مرے گناہوں کے الزام آئیں سر میرے

ندیم میرے ہنر کے وہ لوگ منکر ہیں
مرے عیوب کو کہتے ہیں جو ہنر میرے

اکتوبر ۱۹۶۸ء

○

میں تیرے ساتھ رواں تھا، مگر اکیلا تھا
یہ میں تھا ترے جلو میں، کہ تیرا سایہ تھا

عجب تھیں ہجر کی راتیں، کہ ان کے ماتھے پر
سدا سحر کا ستارہ چمکتا رہتا تھا

تری شمیمِ بدن نے قدم اکھیڑ دیے
میں آندھیوں میں بھی کیسا سنبھل کے چلتا تھا

یہ سوچ کر، کہ میں تیرے بغیر زندہ رہا
میں تیرے سامنے کل رات کتنا رویا تھا

تُو دیکھتا ہے تو کیوں روشنی سی پھیلتی ہے
افق پہ یا تری آنکھوں میں چاند ڈوبا تھا

زمیں ضد پہ اڑی تھی کہ صبح ہو بھی چکے
ستارے ڈوب رہے تھے، چراغ جلتا تھا

یہی کہ عشق سلیقہ ہے زندہ رہنے کا
میں ایک عمر میں بس اتنی بات سمجھا تھا

وہ ایک پل تھا، کہ عصرِ رواں، کہ پوری صدی
ندیمؔ، دل سے جو اک تیر سَن سے گزرا تھا

اکتوبر ۱۹۶۸ء

محنت کش

ہماری روحوں میں ارتقا پر سنوارتا ہے
کہ پیکرِ اضطراب ہیں ہم
نفس نفس شعلہ بار ہو کر پکارتا ہے
کہ ہمسرِ آفتاب ہیں ہم
ہمیں سے ستارگاں کو گردش کی خُو ملی ہے
کہ سربسر پیچ و تاب ہیں ہم
ہمیں سے پھولوں کو رنگ، مٹی کو بُو ملی ہے
کہ حسن ہیں ہم، شباب ہیں ہم

ہمیں سے قائم ہے جب سے اب تک بھرم نمو کا
ہمیں سے بالیدگی جواں ہے
یہ سارا اعجاز ہے ہمارے طپاں لہو کا
جو چار جانب رواں دواں ہے
جہاں جہاں روحِ زندگی رقص کر رہی ہے
ہماری محنت گہر فشاں ہے
اسی لیے تو ہمارے ہاتھوں میں روشنی ہے
ہمارا چہرہ دھواں دھواں ہے

دسمبر
۱۹۶۸ء

○

خوئے اظہار نہیں بدلیں گے
ہم تو کردار نہیں بدلیں گے

غم نہیں بدلیں گے یارو، جب تک
غم کے معیار نہیں بدلیں گے

لوگ آئینے بدلتے ہیں، مگر
اپنے اطوار نہیں بدلیں گے

تم نہ بدلو گے، تو زندانوں کے
در و دیوار نہیں بدلیں گے

قافلے راہ بدلنے پہ مصر
اور سالار نہیں بدلیں گے

چاہیں تو راہ سنا ستا لیں
ہم تو رفتار نہیں بدلیں گے

دسمبر ۱۹۶۸ء

اشعار

فرق اگر ہے تو کہاں روشنی اور سائے میں ہے
دن کی گنتی بھی تو اب رات کے سرمائے میں ہے

یہ الگ بات، کہ لیتا نہیں اپنوں سے حساب
محتسب یوں تو بہت نیک، مری رائے میں ہے

گھر سے نکلے گی فقط رات کو اُس کی بیٹی
اتنی غیرت تو ابھی تک مرے ہمسائے میں ہے

دسمبر ۱۹۶۸ء

اندھیرے نے کہا

کس قدر سرد ہے یہ رات — اندھیرے نے کہا
میرے دشمن تو ہزاروں ہیں — کوئی تو بولے
چاند کی قاش بھی تحلیل ہُوئی شام کے ساتھ
اور ستارے تو سنبھلنے بھی نہ پائے تھے ابھی
کہ گھٹا آئی، اُڑتے ہُوئے گیسو کھولے
وہ جو آئی تھی تو پھر ٹوٹ کے برسی ہوتی
مگر اک بوند بھی ٹپکی نہ مرے دامن پر
صرف یخ بستہ ہواؤں کے نکیلے جھونکے
میرے سینے میں اُترتے رہے، خنجر بن کر
کوئی آواز نہیں —— کوئی بھی آواز نہیں

چار جانب سے سمٹتا ہُوا سناٹا ہے
مَیں نے کس کرب سے اس شب کا سفر کاٹا ہے
دشمنو! تم کو مرے جبرِ مسلسل کی قسم
میرے دل پر کوئی گھاؤ ہی لگا کر دیکھو
وہ عداوت کا سہی، تم سے مگر ربط تو ہے
میرے سینے پہ الاؤ ہی لگا کر دیکھو

دسمبر
۱۹۶۸ء

○

(نذرِ غالب)

گو زر و سیم کے انبار ہیں اغیار کے پاس
دولتِ درد ہے صرف اک ترے فن کار کے پاس

منتشر رخ پہ ترے، صبحِ شبِ وصل کے رنگ
پھول ہی پھول ہیں اس لمحۂ گل بار کے پاس

تیری کافر نگہی کی نہیں کرتا تائید
حرمِ چشم، ترے ابروئے خم دار کے پاس

دور تک اُن کی بصارت بھی ترے ساتھ گئی
صرف آنکھیں ہی تو تھیں تشنۂ دیدار کے پاس

آج تنہائی کی یوں آخری تکمیل ہوئی
مر گئے سائے بھی آ کر تری دیوار کے پاس

ان میں کچھ ہے تو فقط گونج ہے سناٹوں کی
گھر جو آباد نظر آتے ہیں بازار کے پاس

جو چمکتے ہیں، وہی رات کا سرمایہ نہیں
راکھ ہے کتنے ستاروں کی، شبِ تار کے پاس

کتنے چہرے ہیں جنھیں وقت مٹاتا ہی نہیں
اک نمائش سی لگی ہے رسن و دار کے پاس

صرف اتنا ہے، کہ رستے سے شناسائی نہیں
یوں تو سب کچھ ہے مرے قافلہ سالار کے پاس

کچھ حقائق ہیں تو کچھ خواب مرا سرمایہ
بس یہی کچھ ہے حقیقت کے گنہگار کے پاس

جنوری ۱۹۶۹ء



(نذرِ غالب)

میرا ذوقِ دید، تیرا رُوئے زیبا جل گیا
کیا بتاؤں، دشتِ تنہائی میں کیا کیا جل گیا

اپنے جلووں کو غرورِ کبریائی سے نہ دیکھ
اپنی حد سے بڑھ کے جب چمکا ستارا جل گیا

بسکہ مشکل ہے جہنم زارِ دل میں جھانکنا
لوگ کہہ دیتے ہیں، بے چارے کا چہرہ جل گیا

روح کی حدت میں جل بجھ کر بھی، میرے جسم میں
وہ قیامت کی تپش تھی، دستِ عیسیٰ جل گیا

پیاس کیا بجھتی کہ صحرا کا تھا منظر سامنے
دھوپ اتنی تیز نکلی، رنگِ دریا جل گیا

اب تو ذرّے بس سے باہر ہیں، ستارے پاس ہیں
آگ وہ برسی کہ سب معیارِ اشیا جل گیا

درسِ آدابِ محبت میں کٹی عمرِ عزیز
وہ دیا ہوں مَیں، جو اس تربت پہ تنہا جل گیا

فروری
۱۹۶۹ء



(نذرِ غالب)

اب تک تو نور و نکہت و رنگ و صدا کہوں
میں تجھ کو چھو سکوں تو خدا جانے کیا کہوں

لفظوں سے اُن کو پیار ہے، مفہوم سے مجھے
وہ گُل کہیں جسے، میں ترا نقشِ پا کہوں

اب جستجو ہے تیری جفا کے جواز کی
جی چاہتا ہے، تجھ کو وفا آشنا کہوں

صرف اس لیے، کہ عشق اسی کا ظہور ہے
میں تیرے حسن کو بھی ثبوتِ وفا کہوں

تُو چل دیا تو کتنے حقائق بدل گئے
نجمِ سحر کو، مرقدِ شب کا دیا کہوں

کیا جبر ہے، کہ بُت کو بھی کہنا پڑے خدا
وہ ہے خدا تو، میرے خدا! تجھ کو کیا کہوں

جب میرے منہ میں میری زباں ہے، تو کیوں نہیں
جو کچھ کہوں، یقیں سے کہوں، برملا کہوں

کیا جانے، کس سفر پہ رواں ہوں ازل سے میں
ہر انتہا کو ایک نئی ابتدا کہوں

ہو کیوں نہ مجھ کو اپنے مذاقِ سخن پہ ناز
غالب کو کائناتِ سخن کا خدا کہوں

فروری ۱۹۶۹ء



کیا جرم ہے شوقِ خود نمائی؟ — پھولوں کو ہنسی نہ راس آئی
دل کو رہی جستجو ہماری — ہم چھانتے رہ گئے خدائی
ہم خوش ہیں شکستِ آرزو سے — سناٹے میں اک صدا تو آئی
گھٹتے نہیں فاصلے دلوں کے — مٹتا نہیں دردِ نارسائی
بس ایک ہی نقش روبرو ہے — آئینے پہ جم رہی ہے کائی
لمحوں میں سمٹ گیا ترا وصل — برسوں پہ بکھر گئی جدائی

انساں کو کوئی جواب تو دے
یا رب! ترے عدل کی دہائی
صحراؤں کی وسعتوں سے ہٹ کر
خرمن ہی پہ برق کیوں گرائی!

اپریل
۱۹۶۹ء



(نذرِ اقبال)

بجا، کہ یوں تو سکوں تیری بارگاہ میں ہے
مگر یہی تو قیامت مری نگاہ میں ہے

میں جب بھی تجھ سے ملا، جیسے پہلی بار ملا
بڑا سرور ملاقاتِ گاہ گاہ میں ہے

جہاں بھی جاؤں، تعاقب میں ہیں مسائلِ زیست
پناہ صرف ترے حسنِ بے پناہ میں ہے

تمام عمر کی مشقِ گناہ میں نہ ملی
وہ سرخوشی جو مرے اوّلیں گناہ میں ہے

نہ کر سکا میں بغاوت مزاجِ آدم سے
بلا کا نور مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اُفق پہ خلد کے آثار جھلملائے تو ہیں
مگر سُنا ہے، جہنّم بھی اس کی راہ میں ہے

چھپا رہا ہے وہ داغ اپنی بے دماغی کا
جو سر سجا ہُوا زربفت کی کلاہ میں ہے

سحر سے عشق بھی ہو، شام کا شعور بھی ہو
یہی پیام مری آہِ صبحگاہ میں ہے

خدا کا شکر کہ ارزاں نہیں مرے سجدے
مرے وجود کا پندار، لا الٰہ میں ہے

ندیمِ حال کو کھا جائے گا وہ سنّاٹا
کہ جس کی گونج سی، ماضی کی خانقاہ میں ہے

اپریل ۱۹۶۹ء

ہیولیٰ

میرا سایہ بھی حقیقت ہے تو پھر میں کیا ہوں ؟
میں جو پروردہ ہوں خود اپنی انا کا
میں نے
اس حقیقت سے بڑی کوئی حقیقت کبھی سوچی ہی نہیں
کہ فقط میں ہی حقیقت ہوں
اگر میں نہیں، کچھ بھی تو نہیں

کل مرے سائے نے چپکے سے مرے دل میں کہا
تم حقیقت نہیں
سائے ہو حقیقت کے
حقیقت میں ہوں

میرا دعویٰ تمھیں تسلیم نہیں ہے تو ذرا مجھ سے جُدا ہونے کی ہمت تو کرو
میں جہاں جاؤں گا، تم ساتھ رہو گے میرے
کہ مرے سائے ہو تم
اور حقیقت میں ہوں

رات جب آئی تو اس طُرفہ حقیقت کا کہیں نام نہ تھا
میں تھا اور تیرگی کا ایک لق و دق صحرا
جس میں سائے کا کوئی دور کا امکاں بھی نہ تھا
میری مجروح انا
کرب کے زنداں سے نکل کر بولی
کہ فقط میں ہی حقیقت ہوں
اگر میں نہیں، کچھ بھی تو نہیں

میری آواز سے بجھنے لگی تاریکیٔ شب

اور پھر گنبدِ ظلمت میں بھٹکتی ہوئی جب گونج بنی
تو پلٹ آئی
مگر یوں —
کہ اسے میری سماعت بھی نہ پہچان سکی
یہ کسی اور کی آواز تھی
الفاظ کا کچھ اور ہی مفہوم تھا
اور اس میں نمایاں تھے کسی اور ہی ابجد کے حروف :-

میں سکڑ جاؤں تو دن ہوں
میں بکھر جاؤں تو شب ہوں
میں حقیقت کا بدن ہوں
مرے سائے کا ہیولیٰ تم ہو

مئی ۱۹۶۹ء

○

جو شوق ہے، کہ اضافہ ہو نکتہ چینوں میں
نئے گلاب اُگاؤ نئی زمینوں میں

تمام عمر رہے ہم اگرچہ سر بہ سجود
وہی لکیریں کھدی رہ گئیں جبینوں میں

عجیب آب و ہوا تھی شعورِ انساں کی
کئی گمان پنپتے رہے یقینوں میں

بتوں کو آج سروں پر سجا کے نکلے لوگ
وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

یہ کس کے اشک ہیں اے بادشاہِ عدل پناہ
جو ڈھل گئے ہیں ترے تاج کے نگینوں میں

خدا نہ کردہ، کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

مئی ۱۹۶۹ء

کھنڈر

یہ میری تاریخ کا کھنڈر ہے

یہ میرے رہوارِ برق پیکر کی ہڈیاں ہیں

یہ میری تلوار ہے جو تنکا بنی پڑی ہے

یہ ڈھال ہے جس پہ پاؤں رکھ دو تو خشک پتّے کے ٹوٹنے کی پکار سُن لو

یہ میرے پرچم کی دھجیاں ہیں

یہ میری قدروں کی کرچیاں ہیں

یہ میرے معیار ہیں، جو پتھر بنے پڑے ہیں

یہ میرے افکار ہیں، جنھیں عنکبوت نے اپنے تانے بانے کی کھونٹیاں سی

بنا لیا ہے

یہ ٹوٹتی چھت کو سالہا سال سے سنبھالے ہوئے جو اک ناتواں ستون ایستادہ ہے،

یہ مری انا ہے

مئی ۱۹۶۹ء



اب کے یوں موسمِ بہار آیا — اپنا سب کچھ خزاں پہ وار آیا

عمر گزری جسے گرانے میں — سامنے پھر وہی حصار آیا

صفحۂ وقت پر — بہ خطِ جلی — میں ترا نقش تو ابھار آیا

حسن ہر شے کی کیفیت میں ہے — مجھ کو تو رات پر بھی پیار آیا

کتنی عمریں عدم میں گزری ہیں — میں زمیں پر بس ایک بار آیا

نہ ہوئی عشق کی نماز قبول — دل مگر بوجھ تو اُتار آیا

سب کو مجبور کر دیا اس نے

جس کے قبضے میں اختیار آیا

جون ۱۹۶۹ء



کسے معلوم تھا، اِس شے کی بھی تجھ میں کمی ہو گی
گماں تھا، تیرے طرزِ جبر میں شائستگی ہو گی

مجھے تسلیم ہے، تو نے محبت مجھ سے کی ہو گی
مگر حالات نے اظہار کی مہلت نہ دی ہو گی

میں اپنے آپ کو سلگا رہا ہوں اس توقع پر
کبھی تو آگ بھڑکے گی، کبھی تو روشنی ہو گی

شفق کا رنگ کتنے والہانہ پن سے بکھرا ہے
زمیں — بامِ افق پر — اپنے سورج سے ملی ہو گی

سنا ہے، عالمِ لاہوت میں پھر زندہ ہونا ہے
مگر دھرتی سے کٹ کر زندگی کیا زندگی ہو گی

وہ وقت آئے گا، چاہے آج آئے، چاہے کل آئے
جب انساں دشمنی، اپنے خدا سے دشمنی ہو گی

کبھی گر جرم ٹھہرا تذکرہ حسن و محبت کا
تو کس کافر سے ملک و قوم کی بھی شاعری ہو گی

ستمبر
۱۹۶۹ء



کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا

تیرا در چھوڑ کے مَیں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھِر جاؤں گا، صحرا میں بکھر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اُٹھوں گا، تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا، جدھر جاؤں گا

اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا، مر جاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار، کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

اب تو خورشید کو ڈوبے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے مَیں تا بہ سحر جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بُجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

اکتوبر ۱۹۶۹ء

صفر

لوگ جن سورجوں کو دلوں میں سجا کر چلے تھے
کہیں بُجھ گئے
اب تو ہر ہاتھ میں اس کی اپنی ہتھیلی کا جلتا دیا ہے
یہاں جتنے انسان ہیں، ان سے دگنے دیے اور دگنے ہی سائے ہیں
رستوں میں سایوں کی لاشوں کے قتلے پڑے ہیں
قدم جتنے اُٹھتے ہیں، اتنے ہی پنجر چٹختے ہیں
اور آسمانوں پہ ایسی خموشی مسلّط ہے
جیسے وہ بھولے سے بھی گونج بیٹھے تو پھٹ کر بکھر جائیں گے
جیسے وہ اُن خلاؤں کا حصّہ ہیں
جن میں صداؤں کی قبریں ہیں اور کچھ نہیں ہے
صداؤں کی قبریں
دعاؤں کی قبریں
لہو میں نہائی ہوئی التجاؤں کی قبریں

نومبر ۱۹۶۹ء



یوں تو کہنے کو ہے بدن بھی یہی
پیرہن بھی یہی ، کفن بھی یہی

انتظار، ایک دردِ بے انجام
ہے محبت کا بانکپن بھی یہی

شہر کا حسن ہے چمن کی مثال
گھر میں جا بیٹھیے تو بن بھی یہی

گمرہی، اک ادائے معصومی
سادگی بھی یہی ، پھبن بھی یہی

یہی رحمت، جو ہے خزاں کی دعا
دامنِ گل میں شعلہ زن بھی یہی

بات دل سے نکل کے دل میں بسے
زندگی بھی یہی ہے ، فن بھی یہی

نومبر
۱۹۶۹ء

اے دیوتا

— پھر پجاری پکارا کہ اے دیوتا !
تیرے چرنوں کو چھونے مَیں اک بار — سو بار پھر آؤں گا
میں مسافر ہوں
اور دائروں کے مسافر جہاں سے چلے
لوٹ آئے وہیں
ان کی منزل کہیں بھی نہیں
ان کی منزل مسلسل سفر ہے
تو میں تیرے مندر میں اعلان کرتا ہوں اے دیوتا !
تیرے چرنوں کو چھونے مَیں اک بار — سو بار پھر آؤں گا
تو — بشرطیکہ — زندہ رہا

نومبر
۱۹۶۹ء

عشق کے امتحاں

نظر جس طرف بھی اُٹھی
موٹروں کی قطاریں چلی آ رہی تھیں
مرے شہر کے عین مرکز میں، اک قصر
آنکھوں کو پگھلانے والی چمک میں نہایا کھڑا تھا
خواتین گڑیوں کی مانند، پھیلے ہوُئے لان میں منتشر تھیں
ہوا عطر کا بوجھ اپنی خمیدہ کمر پر اٹھائے ہوُئے
رنگینی بکھیر رہی تھی
بہت زور کے قہقہوں میں مسرّت کا اک شائبہ بھی نہ تھا
وقت کے طشت میں سنگریزے سے گرتے تھے!
اور لان کے ایک گوشے میں
طبلے کھڑکتے تھے، سارنگیاں نغمہ زن تھیں

کوئی گا رہا تھا ——
"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

وہاں، ایک چھتنار کے نیم اجالے میں
اک نوجواں، اک حسینہ کو سینے سے بھینچے ہوُئے کہہ رہا تھا —!
اگر عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تو میں پورا اُتروں گا ہر امتحاں میں
کہ مجھ کو حکومت سے لاکھوں روپے کی درآمد کا ایک اور
پرمٹ ملا ہے!

نومبر
۱۹۶۹ء

جوہری جنگ کے بعد کا ایک منظر

وہ سناٹا ہے، جس میں روشنی دم گھٹ کے مر جائے
وہ تاریکی ہے، جو آواز کو پتھّر بنا ڈالے

گماں ہوتا ہے جیسے اب کبھی سورج نہ نکلے گا
جو نکلا بھی تو ان ویرانیوں کا کچھ نہ بگڑے گا

صداؤں کی شعاعیں اب نہ تاریکی میں لپکیں گی
گجر بھی گنگ ہوں گے اور اذانیں بھی نہ گونجیں گی

یہ صحراؤں کے ٹیلے ہیں کہ آسیبوں کے جمگھٹ ہیں
یہ جنگل ہیں کہ رنگ و نکہت و نزہت کے مرگھٹ ہیں

پہاڑوں پر دھواں، کھیتوں میں بھوبھل، تشنہ لب دریا
سمندر سے اُبل کر ساحلوں کو چاٹتا لاوا

یہ کل کا شہر ہے، جس کے کھنڈر صدیوں پرانے ہیں
کہ اس آج اور کل میں سینہ زن کتنے زمانے ہیں

گھروں کے آنگنوں میں سر بریدہ سائے بیٹھے ہیں
زمیں کے قاتلو! یہ آپ کے ماں جائے بیٹھے ہیں

نومبر
۱۹۶۹ء

○

آئنہ دیکھ کے، ایک اور تماشا دیکھو
اپنے پیکر میں مرا حسنِ تمنّا دیکھو

تم کو خوش آئی نہ شاید مری پلکوں کی نمی
دل میں اُترے ہو تو آؤ، مرا صحرا دیکھو

میری پیاسوں، مری آسوں، مری آنکھوں میں کبھی
میرے بَن، میرے گلستاں، مرے دریا دیکھو

نام لے کر مرا، تم اس کو پکارو تو سہی
اس بھرے شہر میں جس شخص کو تنہا دیکھو

میں محبت کے سفر میں نہیں بھٹکوں گا کبھی
اپنے قدموں سے چمکتا ہُوا رستہ دیکھو

میں اگر یاد نہ آؤں، تو چمن میں جا کر
شاخ کے ہاتھ سے گرتا ہُوا پتّہ دیکھو

دسمبر
۱۹۶۹ء

چہل پہل

عجیب دنیا
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ شہر کو دشت میں بدل کر پکارتے ہیں
کہ ہم اکیلے ہیں
کائنات اک عظیم صحرا ہے
جس میں مثلِ غزال ہم اپنے ہمدموں کی تلاش میں ہر طرف رواں ہیں
مگر متاعِ سفر ہماری، فقط زمین اور آسماں ہیں

عجیب دنیا
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ دشت کو شہر میں بدل کر پکارتے ہیں

کہ ہم تو تخلیق کار ہیں
ہم تو ریت سے گلستاں اُگاتے ہیں
سنگ سے آئینے بناتے ہیں
ہم تو تعمیر ہیں، ہم تو ارتقا ہیں

عجیب دنیا
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ خود ہی اپنے غنیم ہیں اور خود ہی اپنے ندیم ہیں
اپنے شاہکاروں کو آگ میں جھونک کر بلکتے ہیں
پھر بھی راکھ شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں
بگڑ رہے ہیں، سنور رہے ہیں، اُلجھ رہے ہیں، سنبھل رہے ہیں
ازل کے دن سے بدلتے آئے ہیں اور اب تک بدل رہے ہیں

دسمبر
۱۹۶۹ء



چاند سورج نگراں رہتے ہیں باطل کی طرف
عصرِ حاضر میں اندھیرا ہے فقط دل کی طرف

خونِ ناحق کی تو خنجر ہی گواہی دے گا
اور جتنے بھی تھے، سب ہو گئے قاتل کی طرف

جب بھی خرمن کی طرف آتے ہیں دہقاں زادے
رُخ بدل جاتا ہے بجلی کا بھی، حاصل کی طرف

زیست مشکل ہے، مگر موت بھی آساں تو نہیں
کس سمندر کی ہے یہ گونج سی، ساحل کی طرف

یوں تو اس کرب سے گھُلتی رہیں شمعیں، لیکن
صرف تکتی رہیں پروانہ، محفل کی طرف

کتنے بھولے ہوئے چہروں کے خدوخال اُبھرے
آج کی رات جو دیکھا مہِ کامل کی طرف

جنوری ۱۹۷۰ء

فردِ جرم

ہم گنہگار ہیں
اور اقبال کرتے ہیں اپنے گناہوں کا
ہم جن گناہوں سے آلودہ ہیں
ان کی فہرست نذرِ وطن ہے

ہم چلے تو اندھیرے کے جنگل میں راہیں اجاگر ہوئیں
ہم رُکے تو خیابان و گلزار بن کر رُکے
ہم جو روئے تو اپنی طرح کے کروڑوں کے رونے میں شامل رہے
ہم ہنسے تو ہماری ہنسی دوسروں کے لبوں سے چرائی ہوئی
مسکراہٹ کا ملبہ نہ تھی

ہم جو کرٹکے تو زنجیر کے دائروں کے دہن کھُل گئے
ہم جو بولے تو روحِ سماعت دلھن بن گئی
ہم نے لکھا تو لفظوں کے صحراؤں میں کشتِ مفہوم افق تا افق
لہلہانے لگی
ہم نے گایا تو آغوشِ آواز میں آدمیت کے جذبے ہمکنے لگے
ہم کسی جبر کے سامنے منمنائے نہیں
ہم جہاں بھی گئے، سرکشیدہ گئے
ہم نے دربار میں بھی پہنچ کر قصیدے سنائے نہیں

جنوری ۱۹۷۰ء

اعتماد

میں نے سورج کے سمندر کے کنارے جا کر
دل شعاعوں میں ڈبویا تو عجب راز کھلا
تیرگی کچھ بھی نہیں تھی، فقط اک پردہ تھا
پردہ سرکایا تو اک مطلعِ پرواز کھلا

جتنے گزرے ہوئے پل تھے، وہ ستارے بن کر
میری پرواز کے رستے میں بچھے جاتے تھے
جتنی قبریں تھیں، وہ روشن تھیں الاؤ کی طرح
جتنے کتبے تھے، وہ فانوس ہوئے جاتے تھے

میں چمکتا ہوا اترا ہوں زمیں پر، جب سے
ایک لمحے کو بہر سُو نگراں پایا ہے
یہ شعاعوں کا وہ قطرہ ہے جو سورج پر سے
دل میں چھپ کر مرے ہمراہ چلا آیا ہے

جنوری
۱۹۷۰ء

○

اشک تھا، چشمِ تر کے کام آیا
میں بشر تھا، بشر کے کام آیا

میری قسمت میں شب تھی، لیکن میں
شمع بن کر سحر کے کام آیا

روح میری، شجر کی چھاؤں بنی
جسم، گردِ سفر کے کام آیا

جبر کو بھی زوال ہے — جیسے
آہن، آئینہ گر کے کام آیا

عجز کو بھی عروج ہے — جیسے
ایک قطرہ، گہر کے کام آیا

زندگی، اہلِ شر کے گھر کی کنیز
خیر کا کام شر کے کام آیا

تاجِ زریں پہ کچھ نہیں موقوف
سنگِ طفلاں بھی سر کے کام آیا

سیم و زر آدمی کے چاکر تھے
آدمی سیم و زر کے کام آیا

فقر و فاقہ میں مر گیا شاعر
شعر، اہلِ نظر کے کام آیا

کاش سُن لوں کہ مرا شہپرِ فن
کسی بے بال و پر کے کام آیا

جنوری
۱۹۷۰ء

ہوا کے روپ

یوں تو دھرتی پر ازل سے سایہ افگن ہے ہوا
خاک سے دامن کشاں ہے، کتنی پُرفن ہے ہوا

اس کا منصب یوں تو ہے مشاطۂ گلزار کا
جب سرِ صحرا پہنچتی ہے تو جوگن ہے ہوا

یہ عناصر کا وہ مظہر ہے، کہ جس کے لاکھ روپ
چیخ ہے، نغمہ ہے، سرگوشی ہے، شیون ہے ہوا

یہ سمیٹے جا رہی ہے کتنے قدموں کے نقوش
کتنی رہزن، پھر بھی کتنی پاک دامن ہے ہوا

زرد پتّے گرتے ہیں شاخوں سے جب روتے ہوئے
سوچتا ہوں، کتنی آوازوں کا مدفن ہے ہوا

جب ہوا چلتی ہے، یادوں سے مہک اُٹھتا ہے ذہن
نگہتیں جتنی بھی ہیں، ان کا نشیمن ہے ہوا

کِھل گئے ہیں ایک جھونکے سے کئی چہروں کے پھول
آج کی شب چاند نکلا ہے کہ روشن ہے ہوا

اس نے انسانوں سے کچھ سیکھا تو کیا سیکھا ندیم
پربتوں کی دوست ہے تنکوں کی دشمن ہے ہوا

جنوری ۱۹۷۰ء

نامناسب

نہیں ہمرہو، یہ مناسب نہیں ہے
یہ تہذیب کی ایک ایسی نفی ہے
کہ تہذیبِ آئندہ کے پاس بھی
اس کے اثبات کا کوئی پہلو نہ ہوگا

اصولوں کی لاشوں کو
یوں دھوپ میں چھوڑ کر
آگے بڑھنا مناسب نہیں ہے
یہ ماضی کی سچائیاں ہیں
اگر حال ان کی صداقت سے منکر ہوا ہے
اگر آج یہ بے حقیقت ہیں

بے مایہ ہیں

بے اثر ہیں

تو کیا تم بزرگوں کی میّت کی ذلّت گوارا کرو گے؟

نہیں ہمرہو، یہ مناسب نہیں ہے

اصولوں کی تربت بناؤ

کفن اِن کو پہناؤ اور دفن کر دو

کہ نسلیں جب آئیں

تو تہذیب کے ان شہیدوں کے مرقد پہ

اپنی عقیدت کے پھولوں کی چادر چڑھانا نہ بھولیں

فروری ۱۹۷۰ء



شکستہ پائی کے مرحلے، دشتِ ہجر میں اس لیے نہ آئے
کہ یہ سفر میں نے طے کیا ہے دراز پلکوں کے سائے سائے

حیات اور کائنات میں ربط تھا، مگر اتنا ربط کب تھا
ہَوا درختوں سے جب بھی گزرے، کسی کی سرگوشیاں سنائے

نہ جانے کس حسنِ بے کراں کی مجھے نمائندگی ملی ہے
زمیں مجھے رنگ روپ بخشے، فلک مجھے آئنہ دکھائے

جسے فرشتوں نے خلد سے، ربِ خُلد کے حکم سے نکالا
وہ خلد زادہ، زمیں پہ تخلیقِ خلد سے کیسے باز آئے

یہ آدمی بھی عجیب شے ہے، اُدھر ستاروں کو چھو رہا ہے
اِدھر ابھی تک فصیلِ شاہی کے سائے میں جھونپڑے بنائے

فقیہہِ شیریں زباں کے حسنِ بیاں کا میں معترف ہوں لیکن
یہ ابر برسے تو میرے کھیتوں کی سمت اک بوند بھی نہ آئے

ندیمؔ تجھ کو خدا حدِ کائنات سے ماورا ملے گا
جو خالقِ کائنات ہے، کائنات میں کس طرح سمائے

فروری ۱۹۷۰ء

ابلاغ

سب صدائیں گنگ، سب الفاظ معنی پوش ہیں
شعر حل کرتے ہیں قلب و ذہن کی باریکیاں
ہونٹ ہلتے ہیں، دہن میں رقص کرتی ہے زباں
لیکن اربابِ سماعت کس قدر خاموش ہیں

جب کلی چٹکے تو میں سنتا ہوں آوازِ درا
جب چمن مہکے تو نکہت چار سُو ہو نغمہ بار
شاخ سے پتہ جو چھن جائے تو چلّائے بہار
روئے اور نوحے پڑھے ننگے درختوں میں ہوا

کب مرا ہر لفظ کلیوں کی چٹک اپنائے گا
کب مری آواز میں مچلے گی خوشبوئے چمن
کب خزاں کی زد میں آئے گا مرا نخلِ سخن
کب زبانِ بے زبانی کا مجھے فن آئے گا

۱۹۷۰ء



برباد کر گیا مرا دستِ دعا مجھے — اب تو خدا کا بھی نہ رہا آسرا مجھے
دی مصلحت نے تربیتِ التجا مجھے — میرا ضمیر مُہر بہ لب کر گیا مجھے
جب دشت دشت اُس نے بکھیرا مرا وجود — پھر کیوں چمن چمن میں پکارے صبا مجھے
امید کی شکست بڑا سانحہ سہی — سناٹے میں سُنائی تو دی اک صدا مجھے
دن کو بھی جل رہا ہوں میں مانندِ شمعِ شب — اے دھوپ! بادلوں کو ہٹا کر بجھا مجھے
حق بات پوچھنے کو نکیرین آئے ہیں — سچ بولنے کا مل تو چکا ہے صلہ مجھے
انصاف کی سزا تو اک اعزاز ہے مگر — پہلے بتا تو دیجیے میری خطا مجھے

اُس کا ستم بھی عدل سے خالی نہیں ندیم
دل لے کے شاعری کا سلیقہ دیا مجھے

مارچ ۱۹۷۰ء

عبادت

عبادت کرو
پتھروں کی عبادت کرو
تیس چالیس صدیوں پرانے بتوں کی عبادت کرو
یاد رکھو مرے ساتھیو
یہ زمانہ بھی پتھر کا ہے

وہ زمانہ بھی پتھر کا تھا
جب تمھیں پتھروں کی قباؤں میں
اپنے خداؤں کے پیکر
چٹانوں میں دبکے ہوئے مل گئے تھے
تمھارے ہی تیشے اُٹھے تو یہ پتھر سنور کر خدا بن گئے تھے
تمھاری ہی تخلیق کے معجزے دیوتا بن گئے تھے

وہی دیوتا
اِس زمانے میں بھی
معبدوں میں نہیں تو تمھارے ضمیروں، تمھارے دلوں اور تمھارے دماغوں میں
پوشیدہ ہیں
وہ تمھارے خیالات ہیں
اور افکار ہیں
لپٹے لپٹائے
اک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہوتے
یہاں تک چلے آئے ہیں
اپنے چہرے ہی دیکھو
تمھاری بھوؤں کے خموں میں بھی پتھر جڑے ہیں
تمھیں پتھروں کی عبادت کے بدلے
دماغوں، دلوں اور آنکھوں کی صورت میں
پتھر ملے ہیں

بس اک آخری مرحلہ اور باقی ہے
تب پتھروں کی عبادت کا تم آخری پھل چکھو گے
عبادت کے اس آخری مرحلے میں
تم اپنے خیالوں کو
خوابوں کو
سب آرزوؤں کو
ساری امنگوں کو
پتھر بنا لو
پھر ان گرم، جیتے ہوئے، سانس لیتے ہوئے
ساری روحوں میں اترے ہوئے
ساری دھرتی پہ بکھرے ہوئے پتھروں کو
خزانے سمجھ کر اٹھا لو

اٹھا لو تو آگے بڑھو
ان کے انبار لے کر بڑھو ـــ اور آگے بڑھو

اور اِن پتھروں سے
تم ان کتنی صدیوں کے بوسیدہ و منجمد پتھروں کو نشانے بناؤ
شرارے اُڑاؤ
نئی آگ روشن کرو
جس میں پتھر کے ہمراہ
وہ دل بھی
وہ ذہن بھی جل بجھیں
جو تمھیں پتھروں کے پجاری بنائے رہے

بُت بنانا، انھیں معبدوں میں سجانا، عبادت سہی
اپنے رستوں سے ان پتھروں کو ہٹانا، عبادت نہیں ہے تو پھر
اور کیا ہے؟

مارچ
۱۹۷۰ء



مر جاتا ہوں، جب یہ سوچتا ہوں　　میں تیرے بغیر جی رہا ہوں
تارے سے خرام جیسے چھن جائے　　میں تجھ سے کچھ اس طرح جدا ہوں
میں تیرے جمالِ چشم و لب میں　　اب دل کا گداز ڈھونڈتا ہوں
تجھ پر سے نظر ہٹاؤں کیسے　　اب تک تری کھوج میں لگا ہوں
یہ تیری تلاش کا صلہ ہے　　میں اپنا وجود کھو چکا ہوں
تو پھول ہے یا صبا ہے، کیا ہے　　میں رنگ ہوں یا مہک ہوں، کیا ہوں
کچھ ایسے لگا جو تو نے دیکھا　　جیسے آئینہ دیکھتا ہوں

دھندلانے لگی ہیں تیری یادیں
میں کتنا غریب ہو رہا ہوں

معبود کے راز جانتا ہوں　　میں بھی مسجود رہ چکا ہوں

آنکھوں میں کٹی ہے عمر لیکن　　جیسے ابھی نیند سے اٹھا ہوں
سو جاتی ہیں جب صدائیں شب کو　　میں اپنے کھنڈر میں گونجتا ہوں
الفاظ سے کون بھیک مانگے　　میں ایک صدائے بے صدا ہوں
اتروں گا چمن پہ اوس بن کر　　میں ٹوٹتی رات کی دعا ہوں
دنیا! ترے حسن کی قسم ہے　　میں عرش سے عرش پر گرا ہوں
گل کی تو ہیں سب صفات مجھ میں　　بس یہ ہے کہ قبر پر کھِلا ہوں

اے صبح! مری گواہ رہنا
میں رات سے عمر بھر لڑا ہوں

مارچ ۱۹۷۰ء

اے خدا

اے خدا، ترے در سے — میں فقیر کیا مانگوں
زخم زخم ہونٹوں سے — صرف اک دعا مانگوں

اے خدا زمانے کے — تو مرا خدا بھی ہے
صرف اک تبسم کی — تشنگی بلا کی ہے

آنسوؤں کو روکوں بھی — مسکرانا چاہوں بھی
اپنے اس ارادے کو — میں اگر نبھاہوں بھی

ذہن کٹنے لگتا ہے — قلب پسنے لگتا ہے
پپڑیوں کی درزوں سے — خون رِسنے لگتا ہے

سوچتا ہوں — مٹی کا — ذہن میں مزا کیوں ہے
اے خدا، مرے منہ میں — تیرا ذائقہ کیوں ہے

اپریل ۱۹۷۰ء



شب گزرنے سے تو انکار نہیں
آج تک صبح کے آثار نہیں
جتنا مشکل ہے ترس کر جینا
اُس قدر موت بھی دشوار نہیں
پل گزرتے ہیں فضا کی مانند
کہیں یہ دَور تو بیمار نہیں
سب زلیخاؤں کے متوالے ہیں
کوئی یوسف کا خریدار نہیں
اب انھیں دودھ نہ بخشیں مائیں
جو محبت کے طرفدار نہیں
جب تک انسان ہے فانی یارب
میری دنیا، ترا شہکار نہیں

اپریل ۱۹۷۰ء

امیر و غریب

کتنے امیر ہیں
مجھ سے محبت کرنے والے !

اتنی بے اندازہ وفائیں !
اتنا پیار ! اتنا ایثار !
میرے ذرا سے دُکھ پر اتنی بہت سی اُداسی !
میری ذرا سی خوشی پر کھُل کر ہنسنا ان کا شعار
مجھ سے محبت کرنے والوں کی نظروں میں
میری فن کارانہ خاموشی کے بھی مفہوم ہزار
مجھ سے محبت کرنے والے
کتنے سنہرے جذبوں کے سرمایہ دار !

کتنے غریب ہیں
مجھ سے نفرت کرنے والے !
ان کے دماغ و دل بیمار
ان کے پاس فقط اک کالی خواہش
صرف اک ننگا مقصد
آخری وار !

مجھ سے محبت کرنے والو !
مجھ سے نفرت کرنے والے چند غریبوں کو بھی بنالو
اپنی بے اندازہ وفاؤں، اپنے سنہرے جذبوں،
اپنے موتیوں کے سے احساسات کا حصہ دار

اپریل ۱۹۷۰ء

○

گیا جو میں کسی محفل میں التجا بن کر
خدا پرست بھی پیش آئے ہیں خدا بن کر

گلہ یہ ہے کہ بگولے اُڑانے نکلا ہوں
میں اپنے دشت میں چلتا ہوں جب ہوا بن کر

مری دعا ہے یہی، میرا مدعا ہے یہی
سکوت کو متلاطم کروں، صدا بن کر

مجھے تو تجھ سے بھی ہے زندگی سے پیار اتنا
کہ جل رہا ہوں کسی ہاتھ کی حنا بن کر

اب ایک بار مجھے اجنبی ہی بن کے ملے
وہ اجنبی جو ملا مجھ سے آشنا بن کر

میں کیوں کروں اسے اظہارِ عشق پر مجبور
کہ لفظ بولتے ہیں سرخیِ حیا بن کر

ندیم صبح کو سوئے فلک نظر جو اُٹھی
زمین پھیل گئی دامنِ دعا بن کر

اپریل
۱۹۷۰ء

مستقبل

ہم اگر آتشِ نمرود میں جل جائیں گے
گُل کھلیں یا نہ کھلیں، دل تو پگھل جائیں گے

سر پہ سورج کا اُترنا ہے قیامت، لیکن
اس کی حدت میں سلاسل بھی تو گل جائیں گے

جن سے انسان کو ذلت کے سوا کچھ نہ ملا
ایسی اقدار کو حالات نگل جائیں گے

اپنے خولوں ہی میں چھد جائیں گے خوابیدہ ضمیر
تیر تاریخ کی چٹکی سے نکل جائیں گے

ریت سلگی تو سمندر سے بھی لَو اُٹھے گی
برف ٹوٹی تو کہستاں بھی پگھل جائیں گے

اک عجب زلزلہ، خود نگری آئے گا
ذہن ہل جائیں گے، معیار بدل جائیں گے

اپریل
۱۹۷۰ء



میری آنکھیں ہیں کہ پڑتے ہیں بھنور پانی میں
آئنہ ڈوب گیا ہے مری حیرانی میں

اتنا معصوم نہ بن، عشق کا مفہوم نہ پوچھ
عقل کی بات نہ کہہ دوں کہیں نادانی میں

بند ہونٹوں پہ تبسم کی جو لَو پھوٹی ہے
ایک آیت ہے ترے مصحفِ نورانی میں

کیا بُرا ہے جو میں زخموں سے ہٹا کر پردے
گُل کِھلاتا ہوں شب و روز کی ویرانی میں

یہ سب احساسِ سیہ کاری و عریانی ہے
ورنہ کیوں رات چھپے صبح کی تابانی میں

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اُٹھتا ہوں
بس یہ خامی ہے مرے طرزِ مسلمانی میں

فصلِ گل میں بھی نہ میں دامنِ صحرا بھولا
کٹ گئی عمر یونہی بے سر و سامانی میں

اس صدی کا اَلمیہ بھی عجب ہے، کہ ندیمؔ
ذات لُٹ جاتی ہے خود اپنی نگہبانی میں

جون ۱۹۷۰ء

ویت نام کا دعوت نامہ

(امریکہ کے شاعروں اور فن کاروں کے نام)

یہاں بھی آؤ، زمین گردانِ حوصلہ مند!
اس مقامِ حیات بخش و حیات کُش کی بھی سیر کر لو
جہاں کی چھتنار جلوتوں میں
ہرے بھرے جنگلوں کے بیٹے
تمھاری خاطر
لہو کے کاسے لیے کھڑے ہیں

یہاں بھی آؤ
جہاں کٹی ہڈیوں کے سازوں پہ
علم اور آگہی کا اک آرکسٹرا
کب سے سینہ زن ہے

یہاں بھی آؤ
جہاں چراغوں میں عصمتوں کی لویں ہیں
دیوار و در پہ ان لڑکیوں کے سر ہیں
جنھیں تمھارے شکاریوں نے
ڈری ہوئی ہرنیاں سمجھ کر ہدف بنایا
تپائیوں پر ہزاروں بچوں کی گول آنکھیں سجی ہیں
جو اپنی حیرتوں کے حصار میں گھومتی ہیں
اور ڈھونڈتی ہیں اپنے بدن کے ٹوٹے ہوئے کھلونے

یہاں بھی آؤ
جہاں تمھارے بڑوں کی تہذیب
اپنے دانتوں میں لحمِ آدم لیے ہوئے
ایشیا کے اربابِ فن کو
ڈیمین کے ترانے سُنا رہی ہے

یہ لمحہ

دشت میں ریت کی دیوار کا سایہ بھی نہیں
سایۂ گُل، سایۂ اشجار کجا
کوئی بادل اگر اٹھتا ہے
تو اس دشتِ ابد رنگ سے کترا کے نکل جاتا ہے

وہ جو اقبال کے صحراؤں میں لالے ہیں
وہ ہم دشت نوردانِ حقیقت کے کفِ پا کے وہ چھالے ہیں
جو پھوٹیں تو کچھ اس طرح کہ چنگاریاں ٹوٹیں
نہ زمیں پر کوئی سایہ
نہ فلک پر کسی سائے کا یقیں ہو نہ گماں ہو باقی

دشت کا کوئی کنارا تو یقیناً ہوگا
یہ تو پھر دشت ہے
اور ظلم کی ظلمت کی بھی حد ہوتی ہے
کہ جو آنکھوں کو بجھاتا ہے
وہ اک روز یہ آواز لگاتا نظر آتا ہے
کہ بابا، مرے کشکولِ بصارت پہ ترس کھا کے چلو!
یہ تو پھر دشت ہے
جو وقت نہیں ہے کہ کبھی ختم نہ ہو

دشت کی آخری حد
کل نہ سہی
ایک صدی بعد سہی
آئے گی
آئے گی ضرور

لیکن اِس وقت یہ عالم ہے
کہ سورج اُتر آیا ہے سوا نیزے پر
اور ماحول کی حدّت سے اُبلتا ہُوا
جو لمحہ گزرتا ہے
وہ بھُن جاتا ہے

جولائی ۱۹۷۰ء

نشاناتِ سفر

یہ جو ہاتھوں کے اشاروں کے نشاں ہیں ہر سُو
یہ کہیں دشتِ ابد میں نہ مجھے لے جائیں
اِن اشاروں میں یہ ہاتھوں کی جو تصویریں ہیں
استخوانی سی ہیں — جیسے کسی آسیب کے ہاتھ
چھُو کے دیکھو تو جو روغن ہے، اُچٹ آتا ہے

انہی ہاتھوں کے اشاروں پہ چلے تھے جو لوگ
کچھ خبر آئی تھی ان کی، نہ صدا آئی تھی
صرف اک گونجتی گھنگھور گھٹا آئی تھی
جس سے جو بوند نکلتی تھی، پلٹ جاتی تھی
کھیت ہونٹوں پہ زباں پھیر کے رہ جاتے تھے

میں حقیقت کا نمائندہ ہوں، دیوانہ نہیں!
ان اشاروں سے جو اپنا سفر آغاز کروں
ان گپھاؤں میں اُترنے سے تو بہتر ہے، کہ میں
اپنے ہاتھوں سے نئی راہیں تراشوں اپنی
نئے شہروں، نئی دنیاؤں کے در باز کروں
یہ الگ بات کہ وہ قبر کے در بن جائیں
ہاتھ میرے بھی، نشاناتِ سفر بن جائیں

اگست ۱۹۷۰ء



وہی نقش روبرو ہے، وہی عکس چار سُو ہے
مجھے تیری آرزو تھی، مجھے تیری آرزو ہے
میں دیارِ شش جہت میں جو تری جہت نہ بھولا
تو کمال کیا ہے میرا، کہ وفا تو میری خُو ہے
مرا ربط ہے جو تجھ سے، وہ ہے ربط گردشوں کا
پسِ ہر غروب مَیں ہوں، پسِ ہر طلوع تُو ہے
کوئی گونجتا ہے مجھ میں، وہ سکوت ہو کہ دل ہو
یہ وفا کی انجمن ہے کہ ابد کا دشتِ ہُو ہے
تو ملا تو یہ ہوس ہے، پسِ خدّ وخال دیکھوں
وہ جو کھو کے جستجو تھی، وہی پا کے جستجو ہے
میں ندیمؔ وہ نہیں ہوں، جو دکھائی دے رہا ہوں
مرا فن مرا بدن ہے، مرا غم مرا لہو ہے

ستمبر ۱۹۷۰ء

ایک پہاڑی گاؤں کے کنوئیں پر

کنوئیں میں جو رسّی بھی جا رہی تھی
وہ چِھلتی ہوئی اک گلابی ہتھیلی سے نکلی تھی
اور خون کی دھار بن کر بھی جا رہی تھی

پھر اِس دھار کو اس گلابی ہتھیلی نے کچھ اس طرح سے سمیٹا
گزوں لمبے اژدر کا اک ڈھیر سا لگ گیا
اُس کے پھن میں لہو تھا

یہ رسّی، بظاہر جو اک ڈول کو کھینچ کر لائی ہے
اصل میں اس چِھلی، نرم و نازک، گلابی ہتھیلی کی
صدیوں پرانی مشقت کی سفّاک بے انتہائی کا اظہار ہے
ستمبر ۱۹۷۰ء



جب یہ طے ہے، میں کبھی تجھ کو نہیں پا سکتا
اب یہ حسرت ہے، تجھے کوئی تو اپنا سکتا

یوں تو برسوں سے مجھے تیری محبت ہے نصیب
میں ترے دل کی مگر تھاہ نہیں پا سکتا

سرِ افلاک مجھے بھی تو ستارے ہی ملے
کاش میں تیرے لیے دردِ دروں لا سکتا

تُو مرے دل میں جو اُترا تو یہ مہلت بھی نہ دی
میں ترے لمس کے اعزاز پہ اِترا سکتا

تُو حقیقت ہے، تو آ اس کی گواہی دینے
اب مجھے تیرا تصور نہیں بہلا سکتا

تو ملا ہے تو تھکن ٹوٹ پڑی صدیوں کی
اب میں مرکر بھی ترے ساتھ نہیں جا سکتا

جس نے گلزار کو مہکے ہوئے جھونکے بخشے
کاش، صحرا میں بھی اک موجِ صبا لا سکتا

دھوپ کے ظلم کا قصہ تو ہزاروں سے سُنا
کاش اس دشت پہ بادل کوئی برسا سکتا

در دیسینے میں چمکتے ہیں کہ تیری شمعیں
زندگی! میں ترے احساں نہیں گنوا سکتا

دامنِ کوہ میں کھلاتا ہے جب پھول ندیم
دنگ ہوتا ہے، کہ پتھر نہیں مرجھا سکتا!

ستمبر ۱۹۷۰ء

اُردن

(آزادیِ فلسطین کے مجاہدین کے قتلِ عام پر)

یہاں تو حدِ نظر تک اک دشت ہے لہو کا
لہو — کہ جس میں ہمارے اپنے لہو کی خوشبو بسی ہوئی ہے
لہو ہمارے جگر کے ٹکڑوں کا

اُن صبیحوں کا
جن میں ربِ قدیر نے
اپنے فنِ تخلیق کو مجسم کیا تھا

اُن بیٹیوں کا
جو حسن اور حیا کی نقاب اوڑھے
مجاہدوں کے نقوشِ پا دیکھتی تھیں
اور سوچتی تھیں
آخر ستارے صرف آسماں سے منسوب کیوں ہیں

اُن ماؤں کا
جو بچّوں کو اپنے سینے کے جھونپڑوں میں سمیٹ کر رو رہی تھیں
اور کہہ رہی تھیں :
ربِّ عظیم ! پیغمبروں کی اس سرزمین کا واسطہ
خدائے جلیل ! اپنے حبیبؐ کا واسطہ
ہمیں خود ہمارے بیٹوں کے خنجروں سے بچا
کہ وہ جس لہو کے پیاسے ہیں
وہ خود اُن کا لہو ہے

ہم سب لہو کے اس دشت میں کھڑے سوچتے ہیں
جو ہاتھ ہم پہ اُٹھے
ہمارے ہی ہاتھ تھے
مگر اُن میں کس کے خنجر تھے ؟
کس کے خنجر تھے ؟
کس کے خنجر تھے ؟
کس سے پوچھیں !
چلو ، چلیں ، آئنوں سے پوچھیں

اکتوبر
۱۹۷۰ء



یارب، تُو اگر اب بھی گریزاں رہا ہم سے
مر جائیں گے سر پھوڑ کے دیوارِ حرم سے

لکھتے ہیں کہ ہم چیختے ہیں، کچھ نہیں کھلتا
الفاظ نکلتے ہیں کہ فریاد قلم سے

تقدیر پہ روتے ہوُے دہقاں کو خبر کب
مٹی کبھی نم ہو نہ سکی آنکھ کے نم سے

جس دشت میں انسان کا نقشِ کفِ پا ہے
اس دشت کا رتبہ نہیں کم باغِ ارم سے

ہم عشق کے معیار کو گرنے نہیں دیتے
ہم زہر بھی پیتے ہیں تو پیمانۂ جم سے

دیوانہ ہوں میں بھی، کہ نکلتے ہیں بہ ہر لفظ
افکار کے خورشید، مرے چاکِ قلم سے

اکتوبر ۱۹۷۰ء

پیش گوئی

اب تو دھوپ نکلی ہے، اب تو برف پگھلے گی
اب تو کوہساروں کے خدّ و خال جاگیں گے

آندھیاں نہ اُمڈیں گی، شعر و فن کے میداں میں
اب خیال نکھریں گے، اب غزال جاگیں گے

پھول گوندھے جائیں گے اِن غبار زلفوں میں
ان اُداس چہروں پر اب جمال جاگیں گے

اب نہ رات بھر ہوگا، دل کو صبح کا دھڑکا
میٹھی نیند سوئیں گے، بے ملال جاگیں گے

اکتوبر ۱۹۷۰ء



چھپا کے سر میں جو تہذیب کے کھنڈر نکلے
وہ اپنے آپ سے کس درجہ بے خبر نکلے

رُکے جو لوگ، تو اک آب جُو بھی دریا تھی
اُتر گئے تو سمندر بھی تا کمر نکلے

ہر ایک روح یہاں، جسم کے لباس میں ہے
کہ پتھروں کو جو توڑا، شرر شرر نکلے

اگر جنوں ہے، تو آداب اس کے شب سے سیکھ
اِدھر ہو چاک گریباں، اُدھر سحر نکلے

یہ سوچ کر میں فقط ایک رہگزر پہ چلا
یہ رہگزر نہ کہیں تیری رہگزر نکلے

لہو پلا کے خزاں میں بھی سینچتا ہوں جسے
بڑا مزا ہو جو یہ پیڑ بے ثمر نکلے

میں اس خیال سے مر مر کے زندہ ہوں، کہ کبھی
حیات کا نہ سہی، موت کا تو ڈر نکلے

ندیمؔ، عدل کی زنجیرِ در بجائی تو ہے
میں ڈر رہا ہوں کہ یہ بھی نہ اُس کا گھر نکلے

اکتوبر ۱۹۷۰ء

سرمایہ

مجھے حنوط کرو

کہ میں وہ جبر تھا، جس کا کوئی جواب نہ تھا

وہ ظلم، جس کی کوئی حد نہ تھی، حساب نہ تھا

مجھے حنوط کرو

میں وہ چھری تھی جو ایمان تک اُتر جائے

جو صرف جسم نہیں، جان تک اُتر جائے

مجھے حنوط کرو

میں اپنے توسنِ وحشت کو جب بڑھاتا تھا

وہ گرد اُڑتی تھی، ہر حسن ڈوب جاتا تھا

مجھے حنوط کرو

لہو لہو تھے اگر لب مرے ذخیروں کے

ضمیر میں نے چبائے تھے باضمیروں کے

مجھے حنوط کرو

کہ میں خود اپنے تضادوں میں پِس کے خاک ہوا

کہ میرا دامنِ زرّیں مجھی سے چاک ہوا

مجھے حنوط کرو

کہ میرا جسم عجائب گھروں کے کام آئے

دماغ چیخ اُٹھیں، جب بھی میرا نام آئے

مجھے حنوط کرو

اکتوبر ۱۹۷۰ء



اس سے پہلے کہ حشر آنے لگے
کاش انسان مسکرانے لگے

ظلم صدیوں کے رنگ لانے لگے
وہ جو جلتے رہے، جلانے لگے

چاند پر جب سے لوگ جانے لگے
صرف پتھر زمیں پہ لانے لگے

جن کا منصب تھا نکہت افشانی
وہی جھونکے غبار اُڑانے لگے

گرد سے اِس قدر اَٹے چہرے
آئنوں پر غبار چھانے لگے

ہم کو معلوم تھا مآل اُن کا
جو نئے تھے، ہمیں پُرانے لگے

ارتقا، ابتدا کو لوٹ چلا
مقبرے راستے دکھانے لگے

مارچ
۱۹۷۱ء



تم یہ کیا معجزے دکھانے لگے
ہم تمہیں کھو کے، خود کو پانے لگے

تم ہمیں کیوں سپردِ شب کر کے
پسِ مژگاں دیے جلانے لگے

اک تمہارا خیال آتے ہی
کیسے کیسے خیال آنے لگے

اچھے وقتوں کو بھول جانے میں
تم کو دو پل، ہمیں زمانے لگے

کتنا کافر ہے کربِ محرومی
ہم بھی دستِ دعا اُٹھانے لگے

مارچ
۱۹۷۱ء



کب تک آخر میں بھرے شہر کو صحرا سمجھوں
اپنے سائے کو جو دیکھوں تو بگولا سمجھوں

یہ چمک سی، جو مری پیاس کو ترساتی ہے
ریت سمجھوں کہ اسے دامنِ دریا سمجھوں

وہ بھی کیا دن تھے، کہ ہر وہم، یقیں ہوتا تھا
اب حقیقت نظر آئے تو تماشا سمجھوں

جس کو بھی دیکھتا ہوں، جستجوئے ذات میں ہے
میں کسے بزم میں شامل، کسے تنہا سمجھوں

تو کبھی گل، کبھی شبنم، کبھی نکہت، کبھی رنگ
تو فقط ایک ہے، لیکن تجھے کیا کیا سمجھوں

مجھ کو کیا علم، غمِ ہجر کسے کہتے ہیں
میں تو ہر گل کو ترا چہرۂ زیبا سمجھوں

اب سحر پھوٹتی ہے تیرے تبسم کی طرح
اب صبا کو بھی تری سانس کا جھونکا سمجھوں

ظلم یہ ہے، کہ ہے یکتا تری بیگانہ روی
لطف یہ ہے، کہ میں اب تک تجھے اپنا سمجھوں

کس قدر قحطِ وفا ہے مری دنیا میں ندیم
جو ذرا ہنس کے ملے، اس کو مسیحا سمجھوں

مارچ ۱۹۷۱ء



اپنے چہروں کو گُل فشاں دیکھو
اپنی روحوں کو خوں چکاں دیکھو

کیا نظر آئے تم کو حسنِ ضمیر
تم تو دامن کی دھجیاں دیکھو

جتنا روشن ہے چاند آج کی رات
اُتنا کالا ہے آسماں، دیکھو

شب کا بھی اک جمال ہے، لیکن
تم تو دن بھی دھواں دھواں دیکھو

جھرّیوں کی نقاب کے پیچھے
عہدِ ماضی کے نوجواں دیکھو

تیرگی میں اسیر پروانو!
اُڑ چلو، روشنی جہاں دیکھو

مارچ
۱۹۷۱ء



ہم اندھیروں سے بچ کے چلتے ہیں
اور اندھیروں میں جا نکلتے ہیں

ایک کو دوسرے کا ہوش نہیں
یوں تو ہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وہ کڑا موڑ ہے ہمیں درپیش
راستے ہر طرف نکلتے ہیں

کتنے عیاش لوگ ہیں ہم بھی
دن میں سو منزلیں بدلتے ہیں

وہ ہُوئیں بارشیں، کہ کھیتوں میں
کرب اُگتے ہیں، درد پلتے ہیں

پتّھروں کا غرور ختم ہُوا
اب تو انساں شرر اُگلتے ہیں

ٹھوکریں کھا رہے ہیں صدیوں سے
گو دلوں میں چراغ جلتے ہیں

اپریل
۱۹۷۱ء

اشعار

کیوں ہر انساں کو اک انساں کی ہوس ہے یارب
جب ہر انساں کی ہوس پر ترا بس ہے یارب

ایک مرتا ہے تو سب قافلہ رو دیتا ہے
ہچکیاں ہیں کہ یہ آوازِ جرس ہے یارب

تجھ کو پوچھوں کہ ترے حسن کے فن پاروں کو
فرصتِ زیست، نفس یا دو نفس ہے یارب

میرے نذرانۂ اشعار کو دے حسنِ قبول
میرا سب کچھ مری آواز کا رس ہے یارب

اپریل
۱۹۷۱ء



کس کو دلدار کہیں، کس کو دل آزار کہیں
جب ہر انسان کو ہم پیار کا شہکار کہیں

دَور یہ وہ ہے، کہ اربابِ شعور و دانش
حسن کا نام نہ لیں، عشق کو آزار کہیں

آج کے لوگ تو لفظوں کے بدل کر مفہوم
ہجر کو وصل کہیں، دشت کو گلزار کہیں

سخت دشوار ہے پتھر کو گلِ تر کہنا
ہاں، جو مجبور رہیں کہنے پہ، وہ ناچار کہیں

وہ بصارت کی کمی ہے، کہ بصیرت زدہ لوگ
دھوپ میں تپتے ہوئے دن کو شبِ تار کہیں

جرم جس طرح پسِ پردۂ در ہوتے ہیں
لوگ اس دَور میں سچ بھی پسِ دیوار کہیں

وہ جو منصور کے سینے پہ سزا بن کے گرا
ہم تو اس پھول کی پتّی کو بھی تلوار کہیں

کب تک اے قوم، یہ حالات کے مارے شاعر
دن کو مصلوب رہیں، رات کو اشعار کہیں

اپریل ۱۹۷۱ء

اجنبی لفظ کی تلاش

کیسے فن کار ہو تم
کیسے شاعر ہو کہ تخلیق کا دعویٰ ہے، مگر ہاتھ میں اظہار کا
کشکول لیے پھرتے ہو
کہ تمھیں دوسرے دیسوں سے کسی لفظ کی خیرات ملے
چاہے یہ لفظ ہو اک پارۂ سنگ
چاہے مفہوم کی ہیبت نے زباں کاٹ رکھی ہو اس کی
تم مگر دوسرے دیسوں سے درآمد شدہ اشیا کے پجاری ہو
کہ معیار کی معراج سمجھتے ہو انھیں

اور وہ لفظ، جو دیسی ہے
جو اس دیس کی مٹی سے اُگا ہے جسے تم اپنا وطن کہتے ہو
یعنی وہ لفظ جو مفہوم کا صد رنگ عجائب گھر ہے
وہ جو اصوات سے پُر ہے
وہ جو اظہار کے سُورج کی کرن ہے
وہ تمھارے لیے بے رنگ ہے
آواز سے محروم ہے
ٹوٹے ہُوئے حرفوں کا کھنڈر ہے
جو صدف ہے، وہ تمھارے لیے صرف ایک خزف ہے

یہ عجب رنگِ سخن ہے کہ بڑے فخر سے تم کہتے ہو
"یہ سخن گنگ سہی
سرد سہی
تابشِ آہنگ کے فقدان سے بے نور سہی

اس کے پیکر پہ مگر ریشم و دیبا کا جو صد رنگ کفن لپٹا ہے
تم اسے چھو کے تو دیکھو لوگو"

کیسے فن کار ہو تم
اپنے آنگن کے درختوں پہ جو گل کھلتے ہیں
ان سے بیزار ہو تم
اور اُن اجنبی پھولوں کے پرستار ہو تم
جن پہ اس دیس کی تتلی بھی اُترتے ہُوئے گھبراتی ہے
تم حقیقت میں تو ہر دور کے فن کار کی مانند بڑے ہو۔ لیکن
خود کو چھوٹا جو سمجھتے ہو تو یہ راز مجھے کھولنے دو
سخت بیمار ہو تم

جون ۱۹۷۱ء



دل میں ہم ایک ہی جذبے کو سموئیں کیسے
اب تجھے پا کے یہ الجھن ہے کہ کھوئیں کیسے

ذہن چھلنی جو کیا ہے، تو یہ مجبوری ہے
جتنے کانٹے ہیں وہ تلووں میں پروئیں کیسے

ہم نے مانا کہ بہت دیر ہے حشر آنے میں
چار جانب تری آہٹ ہو تو سوئیں کیسے

کتنی حسرت تھی، تجھے پاس بٹھا کر روتے
اب یہ مشکل ہے، ترے سامنے روئیں کیسے

جون ۱۹۷۱ء

سیاح کی ڈائری کا ایک ورق

یوں تو جنگل کا گھنا پن ہے بلا کا — لیکن
ان گرانڈیل درختوں پہ نہ پتے ہیں نہ پھول
یوں تو یہ ٹھنٹھ ستاروں کی خبر لاتے ہیں
دیکھ لے ان کو، تو ہنسنے لگے صحرا کی ببول

کتنی شاخیں ہیں، مگر کوئی شگوفہ ہی نہیں
جو نمو کا نہ سہی، حسن کا اظہار کرے
ایک چڑیا بھی نہیں ہے جو اڑانیں بھر کر
سالہا سال کے سناٹوں کو بیدار کرے

یہ وہ جنگل ہے جو جنگل کی روش بھول گیا
اسی عالم میں اسے کتنے ہی جگ بیتے ہیں
کچھ یہاں ہے، تو درختوں کے کروڑوں پنجر
یا وہ کیڑے کہ جڑوں کا جو لہو پیتے ہیں

جون ۱۹۷۱ء



موت و حیات کا مقصد کیا ہے، آخر کچھ معلوم تو ہو
لفظ تو ہیں صدیوں کے پُرانے، ان کا کوئی مفہوم تو ہو

چاہے فرشتوں کی بولی ہو، معنی بھرنا میرا کام
لوحِ مقدّر پر لیکن اک حرف کہیں مرقوم تو ہو

صوت و صدا پر پابندی، تکمیل نہیں خاموشی کی
سانسوں کی آواز بھی روکو، سنّاٹے کی دھوم تو ہو

اس کے قدموں پر برسیں گے نسلوں کی تحسین کے پھول
شاعر اس سے قبل مگر غالب کی طرح مرحوم تو ہو

جون ۱۹۷۱ء



اتنی بلندیوں سے، تہوں میں اتر نہ جا
احسان کر چکا ہے تو احسان دھر نہ جا

پتھرا گئی ہیں در پہ جو آنکھیں لگی ہوئی
کترا کے اُن سے شہرِ وفا سے گزر نہ جا

ہر شخص تجربات کی دنیا ہے، سب سے مل
دانائیاں سمیٹ کے، پیارے! بکھر نہ جا

میں نے کہا تھا کہ طلسمِ انا نہ توڑ
اب اپنا سامنا جو کیا ہے تو ڈر نہ جا

اس شہرِ ناسپاس میں ہیں سنگ زن سبھی
اس کانچ کے لباس میں بیرونِ در نہ جا

دنیا کو ایک طرفہ تماشا سمجھ کے دیکھ
اس آئینے کے سامنے باچشمِ تر نہ جا

عزمِ سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ
منزل ہے آسماں، تو بے بال و پر نہ جا

دل میں اُٹھا ہے درد، تو اظہارِ درد کر
آنسو اُمڈ پڑے ہیں تو منہ پھیر کر نہ جا

صحرائے بے جہت سے حرم کا بھی رُخ نہ کر
دعویٰ جنوں کا ہے تو خدا کے بھی گھر نہ جا

لاکھوں چراغ لا، کہ ہوا تیز ہے بہت
صرف اک دیا جلا کے سرِ رہگزر نہ جا

برحق ہے موت اگر، تو ہے برحق حیات بھی
یوں جیتے جی تو موت کی ہیبت سے مر نہ جا

کھو جائے گی وہاں ترے گیتوں کی گونج بھی
دربارِ شاہ میں پئے عرضِ ہنر نہ جا

دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم
سب جا رہے ہیں جانبِ در، تو مگر نہ جا

جون
۱۹۷۱ء

بیسویں صدی کا اِنسان

مجھے سمیٹو
میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں
نہ جانے میں بڑھ رہا ہوں
یا اپنے ہی غبارِ سفر میں، ہر پَل، اتر رہا ہوں
نہ جانے میں جی رہا ہوں
یا اپنے ہی تراشے ہوئے نئے راستوں کی تنہائیوں میں، ہر لحظہ،
مر رہا ہوں

میں ایک پتھر سہی، مگر ہر سوال کا، بازگشت بن کر جواب دوں گا
مجھے پکارو، مجھے صدا دو

میں ایک صحرا سہی، مگر مجھ پہ گھر کے برسو
مجھے مہکنے کا ولولہ دو
میں اک سمندر سہی، مگر آفتاب کی طرح مجھ پہ چمکو
مجھے بلندی کی سمت اُڑنے کا حوصلہ دو

مجھے نہ توڑو
کہ میں گُلِ تر سہی مگر اوس کی بجائے لہو میں تر ہوں
مجھے نہ مارو
میں زندگی کے جمال اور گہما گہمیوں کا پیامبر ہوں
مجھے بچاؤ — کہ میں زمیں ہوں
کروڑوں کرّوں کی کائناتِ بسیط میں صرف میں ہی ہوں جو
خدا کا گھر ہوں

اگست ۱۹۷۱ء



چھپے جو راز، مری قدرتِ بیاں بن کر
وہ اب لبوں سے برستے ہیں ہچکیاں بن کر

میں تیرے قرب سے صرف اس لیے گریزاں ہوں
کہ تجھ کو یاد رہوں حرفِ داستاں بن کر

کہیں یہ عشق کا اظہارِ ماندگی تو نہیں
کہ تیری یاد بھی آتی ہے لوریاں بن کر

کسی افق پہ تو خم کھا کے مجھ کو چھُو لے گا
تو لاکھ دور رہے مجھ سے، آسماں بن کر

لویں چھنیں بھی، تو شمعوں نے کی نہ موت قبول
کہ وہ تو بزم میں شامل رہیں، دھواں بن کر

اگر برس نہ سکے، ایک پل کو چھاؤں تو دی
جو میرے دشت سے گزرے تھے بدلیاں بن کر

انھیں بھی زیست کے صحراؤں میں نہ راہ ملی
جو پربتوں سے چلے موجۂ رواں بن کر

انھیں زمین کا اک پھول تو دکھاؤ کبھی
جو آسماں سے اُترتے ہیں بجلیاں بن کر

اگر وہ موت نہیں ہے تو زندگی بھی نہیں
وہ زندگی، جو کٹے جنسِ رائیگاں بن کر

مرے بدن میں کھلے جب کسی خیال کا پھول
لہو چلے مری نس نس میں آندھیاں بن کر

ندیم ہوں، مجھے طعنِ شکستہ پائی نہ دے
میں تیرے ساتھ رہا، گردِ کارواں بن کر

ستمبر ۱۹۷۱ء

غرورِ ذات

وہ جو آئندہ کا اک خواب ہے
وہ حال کے بیدار نگاہوں نے کہاں دیکھا ہے
وہ تو یہ دیکھتے ہیں
ان کے سر پر ہیں کلاہیں کہ نہیں
اور اگر ہیں تو وہ کج ہیں کہ نہیں
اور کج ہیں تو وہ کتنی کج ہیں
اور وہ لوگ تو دیوانے ہیں، جن کو اب تک
کجکلاہی کے سوا دہر کا کوئی المیہ نظر آتا ہی نہیں

وہ تو یہ کہتے ہیں
جو کچھ بھی ہے، یہ لمحۂ موجود ہے اور کچھ بھی نہیں

وہ تو یہ سوچتے ہیں
کہ اگر ان کی اکائی ہے تو سب کچھ ہے
وگرنہ دنیا
تو دۂ خاک ہے اور کچھ بھی نہیں
مشتِ خاشاک ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ کروڑوں بھی صفر ہوں تو اکائی کے بغیر
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں

ستمبر ۱۹۷۱ء



بہت مشکل ہے ترکِ عاشقی کا درد سہنا بھی
بہت دشوار ہے لیکن محبت کرتے رہنا بھی

خدا کی طرح، میری چپ کے بھی مفہوم لاکھوں ہیں
اِک اندازِ تکلّم ہے کسی سے کچھ نہ کہنا بھی

اُسے کھو کر میں جیسے زندگی کا حسن کھو بیٹھا
محبت میں مگر اس داغ کو کہتے ہیں گہنا بھی

میں یخ بستہ ہوں، لیکن میرا سورج مجھ پہ چمکے گا
کہ برفوں ہی سے وابستہ ہے دریاؤں کا بہنا بھی

بدن مانگے ہُوئے ملبوس میں چھپنے نہیں پاتے
پہنتے ہیں جو خلعت، مجھ کو لگتے ہیں برہنہ بھی

ستمبر ۱۹۷۱ء

میں روتا ہوں

میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں

اُملیوں کی تانبے کی طرح تپتی ہوئی زرد فصیلوں کے آئینوں میں
جب خود کو مقابل پاتا ہوں
میں روتا ہوں
میں جب بھی اکیلا ہوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں

جب اک اک لمحۂ تنہائی مفلوج سا ہو کر رینگتا ہے
جب شب کاٹے کٹتی ہی نہیں
میں اپنے لہو کے قطروں کو اپنی رگِ جاں میں پروتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں

میں نکہتِ گُل کا رسیا تھا، اب مجھ پر یہ افتاد پڑی
پھولوں سے بچ کر چلتا ہوں، کانٹوں کو دل میں چبھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں

آ، میری جِلد اُتار کے اپنے سارے زخم رفو کر لے

جب تک، اے ماں!

اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعظمت، باعزّت،

باعصمت ماں!

تیرے دامانِ دریدہ کو مَیں آبِ سرشکِ غیرت و غم میں

دھوتا ہوں

میں روتا ہوں

اے ارضِ وطن

میں روتا ہوں

۱۷ر دسمبر ۱۹۷۱ء (شب)

ایک ہی رنگ ہے

زندگی سات رنگوں سے مل کر بنی ہے

مگر آج تو زندگی کا فقط ایک ہی رنگ ہے

خون کا رنگ

میرے — تمھارے — سبھی کے دمکتے ہُوئے خون کا رنگ

جس طرح سورج کا عکس آئینے میں

مرے چار جانب وہی رنگ ہے

میرے اندر وہی رنگ ہے

میرے فن میں — مرے فکر میں — میری یادوں میں — میرے خیالوں میں —

میرے عقیدوں میں

بس ایک ہی رنگ ہے

اور یہ خون کا رنگ ہے

خونِ تاریخ کا

خونِ تہذیب کا

خون اسلاف کے جذبۂ حریت کا
مری آن کا
میری غیرت کا
میری حمیت کا
میری محبت کا
ان حسرتوں، ان امنگوں کا
جو بپاس سے مرگئیں
ان امیدوں کا
جو یاس سے مرگئیں
خون ماؤں کا۔ بہنوں کا۔ بچوں کا۔ شعروں کا۔ نغموں کا۔ گیتوں کا
اسلوبِ گفتار کا
حسنِ کردار کا
میرے پندار کا
یم بہ یم خون
میرا۔ تمھارا۔ سبھی کا

مگر خون کا تو فقط ایک ہی رنگ ہے
چاہے ڈھاکے کا ہو
چاہے لاہور کا
آج کے دن کا
یا آنے والے دنوں کا
ہزاروں کا ہو یا کروڑوں کا ہو
رنگ تو خون کا ایک ہے
اور یہی رنگ ہے آج کی زندگی کا
مرے شہر بھی — میرے گاؤں بھی — جنگل بھی — میدان بھی
میرے کہسار — میرے سمندر
سبھی خون ہی خون ہیں
میرے کڑیل جواں خون ہی خون ہیں
میرا گھر خون ہی خون ہے
میرا دل خون ہی خون ہے

۱۸ دسمبر
۱۹۷۱ء

پُتلی

میں سوچتا ہوں، کہ جب میں تڑپنا چاہتا ہوں
مرے بدن میں کوئی چیز مرنے لگتی ہے
میں سوچتا ہوں، کہ جب میں اُبھرنا چاہتا ہوں
تو نیند میرے لہو میں اُترنے لگتی ہے

میں سوچتا ہوں، کہ جو کچھ ہوں وہ نہیں ہوں میں
میں جو نہیں ہوں وہ کیوں ہوں مجھے بتائے کوئی
فریب دیتے ہیں کیوں میرے آئنے مجھ کو
مرے ضمیر کے اندر سے گھوم آئے کوئی

میں سب کے ساتھ، مگر کوئی میرے ساتھ نہیں
عجب ضدیں مرے اندر کی کائنات میں ہیں
بندھے ہیں میرے رگ و پے میں تار ریشم کے
جو اُن کے اگلے سرے ہیں کسی کے ہات میں ہیں

۳۱ دسمبر
۱۹۷۱ء

سقوط کے بعد

یہ کیسا موسم آیا ہے
سورج سر پر دہک رہا ہے
دھوپ کی آگ سے دشت و جبل اور ساحل و بحر سلگنے لگے ہیں
کرنیں، خون کے دھارے بن کر
شہروں کے دیوار و در کو چاٹ رہی ہیں
حدِ نظر تک پھیلے کھیتوں سے، بھٹی میں بُھنے اناج کی بُو آتی ہے
جلتے ہُوئے اشجار کی صورت میں، دھرتی سے جیسے کوئلہ اُگ آیا ہے
لیکن میرے دل و دماغ پہ برف کے گالے اُتر رہے ہیں
میرا ہاتھ — اور میرا قلم — اور میرا فن
سب کتنے یخ ہیں!
کتنے یخ ہیں!!

یکم جنوری
۱۹۷۲ء

باقی ہے

دل کی تائید، نہ اقرارِ زباں باقی ہے
اب جو ایمان کی پوچھو تو گماں باقی ہے

لوگ اس بزم میں کیا دیکھنے آئے ہیں، جہاں
کچھ جو باقی ہے تو شمعوں کا دھواں باقی ہے

وقت نے کر دیے پامال ضمیروں کے حصار
صرف اک آرزوئے امن و اماں باقی ہے

میں جو زندہ ہوں تو صرف اپنی انا کے دَم سے
کٹ چکا جسم، مگر یہ رگِ جاں باقی ہے

ابر امڈا ہے تو اک بار برس کر دیکھے
کہ مری خاک میں کیا تاب و تواں باقی ہے

یکم جنوری
۱۹۷۲ء



لخت لخت چہروں کو، آئنوں میں کیا دیکھیں
آؤ، اپنے بارے میں، اپنے ذہن سے سوچیں

اے جمالِ آزادی، اے غزالِ آزادی
ہم کہ خاک بر سر ہیں، تیرا ساتھ کیسے دیں

وہ جو شعلہ پیکر تھے، بجلیوں کے ہمسر تھے
اپنی آگ سے ڈر کر، اپنی راکھ سے کھیلیں

آنکھ تک جھپکنے کا، کس میں حوصلہ ہوگا
دیکھیں ٹکٹکی باندھے، جب کئی کروڑ آنکھیں

دشتِ بے اماں کی حد، روح سے بدن تک ہے
ٹکڑے ٹکڑے بادل ہیں، کیا کریں، کہاں برسیں

شاید اس نظارے سے ربِّ دو جہاں چونکے
آؤ، اپنے ملبے پر بیٹھ کر دعا مانگیں

جب اجڑ چکی محفل، جب بکھر چکے ہمدم
جب بدل چکا سب کچھ، ہم بھی اپنی لَے بدلیں

تاج گر بھی جاتے ہیں، تاج مل بھی جاتے ہیں
تاج ڈھونڈنے والے، پہلے اپنے سر ڈھونڈیں

جن کے ذہن سے اُبھرے آفتاب دانش کے
دھوپ کیوں نہ چھلکائیں، برف بن کے کیوں پگھلیں

آسمان صحرا سا ہے ، تیرگی قیامت سی ہے
نجمِ نیم شب بن کر، خود کو ڈھونڈنے نکلیں

اے ندیم، میرا تو تجربہ ہے صدیوں کا
ہر غروب کے پیچھے تھیں طلوع کی کرنیں

۱۲ جنوری
۱۹۷۲ء

○

کیا خبر تھی، یہ زمانے بھی ہیں آنے والے
سوتے رہ جائیں گے سوتوں کو جگانے والے

میری آنکھیں مجھے لوٹا کہ تجھے دیکھ تو لوں
اے بصارت کے چراغوں کو بجھانے والے

عمر کاٹوں گا ترے ذہن کی جراحی میں
اے مجھے میری ذہانت سے بچانے والے

خود تری عمر تو گندم کے نشے میں گزری
اے مجھے فتنۂ گندم سے ڈرانے والے

جب مری پیاس سے ڈھلتا تھا ترا بادۂ ناب
اب وہ ایّام نہیں لوٹ کے آنے والے

سر بر آوردہ ہیں اِس وقت ترے ہجو نگار
سر بزانو ہیں قصیدے ترے گانے والے

خود سے ہو جاتے ہیں اِک دن متعارف آخر
وقت کی جھیل کو آئینہ بنانے والے

لوگ اُس وقت کو آشوبِ جہاں کہتے ہیں
سر اُٹھا لیتے ہیں جب ناز اُٹھانے والے

جانے اب تک تُو کہاں تھا، کہ دکھائی نہ دیا
اے مجھے حدِ نظر تک نظر آنے والے

۱۳؍جنوری
۱۹۷۲ء

دوستو، آؤ

دوستو! آؤ، اپنے ریزے آپ سمیٹیں
آؤ، فاتحہ خوانی کی جو صفیں ہمارے صحنوں اور ذہنوں میں بچھی ہیں، ان کو لپیٹیں

دوستو! آؤ، زندہ رہیں ہم عزم و یقیں سے، جب تک سانسیں آئیں جائیں
آؤ، قبروں کو قبریں رہنے دیں، اور اپنے تاریک گھروں میں چراغ جلائیں

دوستو! آؤ، بھوبھل میں چنگاری ڈھونڈیں
آؤ، خزاں کی زرد پتاور کے نیچے جو دفن ہوئی، وہ نکہتِ بادِ بہاری ڈھونڈیں

دوستو! آؤ، اپنی اَنا کا ملبہ کھودیں
آؤ، چٹختی دھرتی میں، جو اشکوں سے سیراب ہوئی ہے، امیدوں کے موتی بو دیں

دوستو! آؤ، خون آلود زمیں سے پھول اُگانا سیکھیں
آؤ، محنت اور لگن سے جینا سیکھیں، عزت سے مرجانا سیکھیں!

۲۲؍جنوری ۷۲ء

دُعا

یارب، مرے وطن کو اک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فَضا کو نکھار دے

یارب، مرے وطن میں اک ایسی ہوا چلا
جو اس کے رُخ سے گرد کے دھبّے اُتار دے

یارب، وہ ابر بخش کہ جو ارضِ پاک کو
حدِّ نظر تک اُمڈے ہُوئے سبزہ زار دے

میداں جو جل چکے ہیں، بجھا ان کی تَشنگی
شاخیں جو لُٹ چکی ہیں، انھیں برگ و بار دے

ہر فرد میری قوم کا، اک ایسا فرد ہو
اپنی خوشی، وطن کی خوشی پر جو وار دے

یہ خطّۂ زمین معنون ہے تیرے نام
دے اس کو اپنی رحمتیں اور بے شمار دے

جنوری
۱۹۷۲ء

بچّوں کا کھیل

سکیسر[1] کے قدموں میں اک جھیل ہے
جس میں مرغابیاں تیرتی ہیں
تو تصویر لگتی ہیں

چاروں طرف سر برآورده کہسار ہیں
جو غزالوں کے مسکن ہیں

جنگل ہیں جن میں کہُو اور زیتون کی چھاؤں
قالین کی طرح بچھتی ہُوئی
رتڑیوں[2] تک پہنچتی ہے
(یہ رتڑیاں سرخ مٹّی کے کہسار پارے ہیں
جو کرۂ ارض کی ابتدا کی نمائندگی کر رہے ہیں)

---

[1] وادیٔ سون (ضلع سرگودھا) کا ایک پہاڑ
[2] سرخ رنگ کی مٹّی کی یہ صف بہ صف پہاڑیاں وادیٔ سون کے شمال میں ضلع کیمبل پور کی تحصیل تلہ گنگ تک پھیلی ہُوئی ہیں۔

ہرے کھیت، زینہ بہ زینہ تراشے ہُوئے
جھیل کے ساحلوں سے اُبھرتے ہُوئے
آسمانوں میں گھُستے نظر آرہے ہیں

یہاں دستِ قدرت کی فیّاضیاں اوج پر ہیں

مگر چشمِ قدرت نے شاید یہ دیکھا نہیں ہے
کہ اس جھیل کے اک طرف میرا گاؤں بھی ہے
جس کی ڈھلوان گلیوں میں
سونے کی رنگت کے معصوم بچّے
گھِسے سنگ ریزوں سے
بلور کی گولیاں کھیلتے ہیں

۲۳ جنوری
۱۹۷۲ء



طوفان ہے ہمرکاب میرا — ہر خیمہ ہے بے طناب میرا
کتنی سفّاک ہے حقیقت — مٹی میں رلا ہے خواب میرا
ہاں، شب تو گزر چکی ہے کب کی — ابھرا نہیں آفتاب میرا
میں خود کو چھپا رہا ہوں خود سے — بادل مرے، ماہتاب میرا
دھندلے دھندلے سبھی مناظر — ہے دیدۂ دل پُرآب میرا
اے کاش، کہیں برس بھی جاتا — گرجا تو بہت، سحاب میرا

شاید مرے رہنما سمجھ لیں — شعروں میں سہی خطاب میرا
جو پوچھتے تھے سوال مجھ سے — سنتے ہی نہ تھے جواب میرا
کتراتے رہے جو آئنوں سے — کرتے رہے احتساب میرا

اے سنگ زنو! بہار آئی — پتھر پہ کھِلا گلاب میرا
میں دشتِ بلا میں لَو دئے کی — بامعنی ہے پیچ و تاب میرا
دنیا بھی تو حشر ہے الٰہی! — دنیا ہی میں کر حساب میرا

آسودہ ہیں سارے انقلابی
اب آئے گا انقلاب میرا

جنوری
۱۹۷۲ء

دوہے

لالچ تاج و تخت کا، کڑی کمان کا تیر
کھینچتا ہے ہر دَور پر، لہو کی ایک لکیر

○

دیکھے کل چوپال پر، کئی امیر کبیر
قد اُونچے، طرّے بڑے، ذرا ذرا سے ضمیر

○

نذرانے لیتا ہُوا، گاؤں میں آیا پیر
ریشم کے ملبوس میں، مانگے بھیک فقیر

○

ہیر گریباں چاک ہے، چادر ریر و لیر
رانجھا ونجھلی توڑ کر، تکتا ہے دلگیر

○

دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈیں کوئی نظیر
دور دیس میں قید ہیں، جن بہنوں کے ویر

○

کون بڑھائے حوصلے، کون بندھائے دھیر
سب ہاتھوں پر خون ہے، سب آنکھوں میں نیر

۳۱ جنوری ۱۹۷۲ء

قانونِ فطرت

وقت بڑھتا ہے، مگر سمت بدلنا بھی تو ہے
چاند چھپتا ہے، مگر چاند نکلنا بھی تو ہے
ایک پتھر جو اپاہج ہے کئی صدیوں سے
قعرِ دریا میں اُترتا ہے تو چلنا بھی تو ہے
جو دیا طاق پہ رکھا تھا، اگر بجھنے لگا
دل جو سینے میں دھڑکتا ہے، وہ جلنا بھی تو ہے
اک نہ اک روز جھپٹتے ہیں شغالوں پہ غزال
جام بھر جاتا ہے جس وقت، چھلکنا بھی تو ہے
جبر کی آگ ہمیشہ تو نہیں جل سکتی
چاہے خورشیدِ قیامت ہو، وہ ڈھلنا بھی تو ہے
برف انبار در انبار جمی ہے —— لیکن
ایک موسم میں یہ کہسار پگھلنا بھی تو ہے

۳۱ جنوری ۱۹۷۲ء

(۱)

جب سے ہم تقسیم ہُوئے ہیں نسلوں اور زبانوں میں
حائل ہیں کتنے آئینے آپس کی پہچانوں میں

آدمیوں نے اب تک اپنے حسن کا محور پایا نہیں
اب بھی سرشتِ انسانی کے جھگڑے ہیں نادانوں میں

خود میرے دامن کی ہوا نے اسی چراغ سے لَو چھینی
میں نے جس کو روشن رکھا صدیوں کے طوفانوں میں

رات کی پچھلی گھڑیوں میں جب روشنیاں گل ہوتی ہیں
اک آسیب سا ڈگ بھرتا ہے، بڑے بڑے ایوانوں میں

کہساروں پر جس کے دم سے آتشِ دل گلزار بنے
وہی ہوا کیوں آگ لگائے، جب اُترے میدانوں میں

نام جو روشن ہو تو اِس کا، برق گرے تو اُن پہ گرے
ایک رئیس نے اپنے خرمن بانٹ دیے دہقانوں میں

چاند پہ لوگ اب پہنچے، لیکن "پس ماندہ" قوموں کے کسان
وقت کو کب سے تول رہے ہیں تاروں کی میزانوں میں

میری اک اک نیکی چمکے میرے عوام کے چہروں پر
میرے گناہوں کی فہرستیں شاہوں کے فرمانوں میں

ایسی نسل سے امن و سکوں کی آخر کون امید کرے
جس کی ساری عمر کٹی ہو جنگوں اور بحرانوں میں

درِ عدالت پر اب دستک دوں تو کیسے دوں کہ ندیم
سائل بوٹی بوٹی ہو کر بٹنے لگے دربانوں میں

فروری
۱۹۷۲ء



چارہ گرو، کیوں اُلجھاتے ہو غنچہ و گل کے فسانوں میں
میں چمنستانوں سے گزر کر پہنچا ہوں ویرانوں میں

حسن کا ساماں بیچو، لیکن حسن کو تو بکنے سے بچاؤ
یارو، کوئی فرق تو رکھو گھروں میں اور دکانوں میں

عصرِ رواں کا تقاضا شاید رستہ تکتا ہے، ورنہ
مل جاتے یا مر جاتے تھے لوگ قدیم افسانوں میں

ایک حقیقت یہ ہے کہ تم جب دل میں اُترے، دل میں رہے
ایک روایت یہ ہے کہ یوسف رکتے نہیں کنعانوں میں

تم نے میرے دل کا کعبہ کتنے بتوں سے پاٹ دیا
اور اُدھر کعبے بستے ہیں لُٹے ہُوئے بُت خانوں میں

اب تم آئے ہو تو مری جاں، زحمتِ لطف و کرم نہ کرو
گل کیا، آنسو تک نہیں رکتے پھٹے ہُوئے دامانوں میں

حشر تو برپا ہوگا لیکن حشر نہیں برپا ہوگا
جب تک مہر و وفا کی رسمیں زندہ ہیں انسانوں میں

میری غزل کے آئینے میں جھانکو گے تو مانو گے
تم سا حسیں پیدا ہوتا ہے کئی ہزار زمانوں میں

یہ جو ندیم مرے شعروں میں سازِ محبّت بجتا ہے
گونج کچھ ایسی ہی تو سنی تھی روزِ ازل کی اذانوں میں

فروری
۱۹۷۲ء

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
جہاں سے پھول ٹوٹا تھا۔ وہیں سے　کلی سی اک نمایاں ہو رہی ہے
جہاں بجلی گری تھی۔ اب وہی شاخ　نئے پتّے پہن کر تن گئی ہے
خزاں سے رک سکا کب موسمِ گل
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
کھنڈر سے کل جہاں بکھرے پڑے تھے　وہیں سے آج ایواں اُٹھ رہے ہیں
جہاں کل زندگی مبہوت سی تھی　وہیں پر آج نغمے گونجتے ہیں

یہ سناٹے سے لَے کی سمت ہجرت
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
نہیں تلخ تشنگی کا خوف۔ جب تک　شعاعیں برف پر لرزاں رہیں گی
اندھیرے جم نہیں پائیں گے۔ جب تک　چراغوں کی لویں رقصاں رہیں گی
بشر کی، اپنی ہی تقدیر سے جنگ
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

مارچ
۱۹۷۲ء

شبنم کے ساتھ حادثہ

شب کو شبنم کا اُترنا تو عناصر کا تقاضا تھا
سو شبنم اُتری
شب، جو ظلمات کی پروردہ ہے
تاریک تو ہوتی ہے
کہ تاریک نہ ہوگی تو وہ شب کیا ہوگی
شبنم اس شب کے خم و پیچ سے آگاہ نہ ہوتی
تو اُترتی کیسے
سو وہ صدیوں کے وظیفے کے مطابق اُتری
تو اُترتے ہی مچل کر رودی
اور چلّائی ——

— کہاں ہیں مری کلیاں، مرے غنچے، مرے پھول
نہ کسی شاخ پہ پتّہ، نہ کسی کھیت میں اک نوکِ گیاہ
ہر طرف ریت کے انبار — نمو کی قبریں
اور میں روحِ نمو — جوئے نمو
اب زمیں پر جو اترتی ہوں تو مر جاؤں گی
اور پلٹ بھی نہیں سکتی کہ پلٹنا تو نہیں خوئے نمو

مارچ
۱۹۷۲ء

ایک ذاتی نظم

عمر بھر جن کو سکھاتا رہا میں ابجدِ فن
طعنہ زن ہیں مرے فن پر کہ یہ گہرا ہے بہت
جیسے خفاش نے خورشید کے بارے میں کہا
صورت اچھی ہے مگر رنگ سنہرا ہے بہت

وہ جنھیں منصبِ شاعر سے نہیں آگاہی
نوکِ شمشیر سے شعروں کی گرہ کھولتے ہیں
صحنِ گلشن میں بھی پایا انھیں میزان بدست
پھول کو جنسِ تجارت کی طرح تولتے ہیں

ذات کے گنبدِ بے در میں جو بھٹکے برسوں
انھیں انسان کے رشتوں کی خبر کیا ہوگی
یوں بظاہر تو وہ اربابِ نظر ہیں لیکن
جو محبت سے نہ اُٹھی، وہ نظر کیا ہوگی

جن کے معیار بدل جاتے ہیں ہر موسم میں
استقامت کا وہ مفہوم کہاں سمجھیں گے
جن کے نزدیک بصارت ہے فقط عجزِ نگاہ
دشت کو آگ، پہاڑوں کو دھواں سمجھیں گے

جن کو لفظوں کے معانی سے کچھ ایسی کد ہے
بات کرتے ہی پشیماں سے رہ جاتے ہیں
اُن کو کیا میرے مقامات کا عرفاں ہوگا
جو مجھے دیکھ کے حیراں سے رہ جاتے ہیں

مارچ
۱۹۷۲ء



خلا میں پرتوِ آدم دکھائی دیتا ہے
یہ ریگزار مجھے نم دکھائی دیتا ہے

کبھی چمن میں، کبھی ذہن میں، ہوا میں کبھی
جو آنے والا ہو موسم، دکھائی دیتا ہے

اڑا کے لے گئی پتّے، خزاں کی تند ہَوا
شجر علامتِ ماتم دکھائی دیتا ہے

مجھی کو میرے مقابل نہ لا، خدا کے لیے
اِس آئینے میں مجھے کم دکھائی دیتا ہے

قریب تھا تو نظر خال و خد پہ رک نہ سکی
تُو جب سے دُور ہے، پیہم دکھائی دیتا ہے

تجھے خطوطِ بدن کی قسم، خدا مت بن
خدا تو وہ ہے جو مبہم دکھائی دیتا ہے

زمیں وہ کعبۂ تخلیقِ حسن و فن ہے ندیمؔ
سرِ فلک بھی جہاں خم دکھائی دیتا ہے

اپریل
۱۹۷۲ء

۲۵- الفاظ

(بنگلہ دیش کی "بہاری" آبادی کے خطوط)

عالمی ریڈ کراس نے ۲۵- الفاظ تک کے خطوط لکھنے کا اصول طے کیا تھا

رات ہے
گھات میں دشمن ہے
وہ دشمن، جو مرا بھائی ہے
میرا ہتھیار، فقط —
(اے مرے اربابِ وطن)
آپ کی بخشی ہُوئی تنہائی ہے

(۲)

چلو، یوں کریں
اس نگر سے سمندر میں کُودیں
مگر جسم کے ساتھ پتھر بھی ہوں
اپنی تاریخ کے

اپنی تہذیب کے
اپنے ایمان کے

(۳)

نظریات کے بلور کی کرچوں کو
مرے سینۂ بریاں میں بھر دو
اور پھر میرے تڑپتے ہوئے لاشے کے چھناکے پہ
کوئی رقص کرو
رقص کرو

(۴)

میرے نورِ نظر!
جب صدی دو صدی بعد
اس سمت آنا
کسی ناریل کے تلے
(کوئی بھی ناریل ہو)
مجھے یاد کرنا
مجھے بھول جانا

(۵)

میں پکاری
میں عورت بھی ہوں
عالمِ آدمیت کی عزت بھی ہوں
اور وہ بولا
کہ میں تیرا بھائی بھی ہوں
اور فدائی بھی ہوں

(۶)

شہرِ ٹیگور کے ایک بازار میں
تین سو میری عصمت کی قیمت پڑی
آخری بولی جس شخص نے دی
وہ ٹیگور کا کتنا ہم شکل تھا!

(۷)

میں واپس جب آئی
تو رو کر پکاری —

"مرا جسم اب چیتھڑا ہے"
کہا میری امّی نے —
"بیٹی نہ رو
سب کا شاہد خدا ہے"

(۸)

بھیّا، جب تم مجھ کو لینے آنا
اُردو کا اک لفظ نہ کہنا
چپکے رہنا
مجبوراً کچھ کہنا پڑے تو اتنا
"میں گونگا ہوں"

مئی
۱۹۷۲ء



نئے انساں کی جو رعنائی ہے — ادھ کھُلی نیند کی انگڑائی ہے
لفظ، معنی سے جُدا اُس کے بغیر — وہ مری قوّتِ گویائی ہے
اُس کو تکتا ہوں کہ دم توڑتا ہوں — آنکھ روشن ہے کہ پتھرائی ہے
کتنا سادہ ہوں، کہ میں سمجھا تھا — دن، حریفِ شبِ تنہائی ہے
روز مرتا ہوں تو جیتا بھی ہوں — یہ مرا شغلِ مسیحائی ہے

آئنہ لا کے مقابل رکھ لے
زندگی انجمن آرائی ہے

جون
۱۹۷۲ء



موت کی انجمن آرائی ہے — اور خدا ہے کہ تماشائی ہے
میرا بھائی بھی ہے دشمن میرا — میرا دشمن بھی مرا بھائی ہے
برگِ گل ہوں سرِ سیلابِ ہوا — جستجو دشت میں لے آئی ہے
لوگ شہروں میں بھی تنہا کیوں ہیں — رخ پہ کیوں وحشتِ صحرائی ہے
کس نے دنیا کی حقیقت سمجھی — جس نے سمجھی وہی سودائی ہے
روشنی کے لیے گھر پھونک دیا — میری دشمن مری دانائی ہے

کتنی صدیوں سے میں پیاسا ہوں ندیم
کتنی صدیوں سے گھٹا چھائی ہے

جون
۱۹۷۲ء

چاکِ گریباں

اس نے جب میرے چاکِ گریباں کو دیکھا تو بولی
'نمودِ سحر ہو رہی ہے'

مجھے قیس کی یاد آئی
کہ موجِ ہوائے بیاباں میں
اس کے گریباں کے ہر چاک سے
"لیلیٰ لیلیٰ" کی آواز آتی تھی

کہتے ہیں
اک روز آندھی چلی
اور لیلیٰ جو خیمے میں خوابیدہ تھی

چیخ اُٹھی تھی
'مرے قیس، تو آئنے کیوں سجائے کھڑا ہے
مجھے تیرے دامن کے ہر چاک میں
اپنی صورت نظر آرہی ہے'

گریباں تو یکساں ہیں ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک کے عاشقوں کے
وہ ہیلن کا، لیلیٰ کا یا ہیر کا ہم زمانہ ہو
یونان کا دل گرفتہ ہو یا نجد و پنجاب کا
ایک ہی لمحۂ بے بسی میں گرفتار ہے
وہ گریباں کو یوں چاک کرتا ہے جیسے بدن چاک کرنے چلا ہے

مگر اس نے جب میرے چاکِ گریباں کو دیکھا تو بولی
'نمودِ سحر ہو رہی ہے'

اگست
۱۹۷۲ء



آنکھیں تری، کیوں لُٹی ہُوئی ہیں — یہ ہرنیاں کیوں ڈری ہُوئی ہیں
شمعیں تو ہیں پتلیوں میں روشن — اندر سے مگر بجھی ہُوئی ہیں
کیا آئنۂ نگاہ ٹوٹا! — سب صورتیں کیوں کٹی ہوئی ہیں
ہر ایک چٹان بولتی ہے — شکلیں سی عجب بنی ہوئی ہیں
گو سب کے دہن میں ہیں زبانیں — تالو سے مگر سِلی ہُوئی ہیں
دل دشت ہے، اور اس میں یادیں — لاشوں کی طرح پڑی ہُوئی ہیں
سورج تو چمک رہا ہے سر پر — قدموں میں شبیں بچھی ہُوئی ہیں
دروازہ محل کا ہے مقفل — گو کھڑکیاں سب کھلی ہُوئی ہیں
شائستۂ شاعری کہاں ہیں
غزلیں تو بہت کہی ہُوئی ہیں

اکتوبر
۱۹۷۲ء



میں حقائق میں گرفتار ہوں، وہموں میں نہیں
کوئی نغمہ مری زنجیر کی کڑیوں میں نہیں

ٹھنٹوں ٹھنٹوں ہیں پت جھڑ میں کھڑا سوچتا ہوں
جتنے پتے ہیں یہاں، اُتنے درختوں میں نہیں

شہر والو! یہ گھروندے ہیں، یہ گلیاں ہیں، یہ کھیت
گاؤں والوں کی جو پوچھو تو وہ گاؤں میں نہیں

غیر محسوس بہاروں کا وہ دَور آیا ہے
رنگ غنچوں میں نہیں، نکہتیں پھولوں میں نہیں

میں جو روؤں، کوئی ہوتا نہیں ہنسنے والا
جو سکوں دشت میں دیکھا ہے، وہ شہروں میں نہیں

گرد کیسی، کہ کوئی قافلہ آیا نہ گیا
نقشِ پا کیسے، کوئی گونج بھی رستوں میں نہیں

اس زمانے کے جو دُکھ ہیں، وہ نرالے دُکھ ہیں
کچھ علاج ان کا، بزرگوں کی بیاضوں میں نہیں

صرف دہقان کے خرمن کو بھلا کیوں تاکے
برق حالات میں ہوتی ہے، گھٹاؤں میں نہیں

پل گزرتا ہے کہ جل جاتا ہے اک سیّارہ
وقت کا راز جو لمحوں میں ہے، صدیوں میں نہیں

رہنماؤں سے بس اتنا سا گلہ ہے مجھ کو
ان کے ہونٹوں پہ جو باتیں ہیں، وہ ذہنوں میں نہیں

پاؤں مٹی نے وہ پکڑے ہیں، کہ ہلنا ہے محال
اب کوئی لطف خیالوں کی اُڑانوں میں نہیں

شعر میں بات چھپانے کی روش ترک کرو
اب تو افلاک کے اسرار بھی پردوں میں نہیں

اکتوبر
۱۹۷۲ء



یہ ہو رہی ہیں جو سرگوشیاں ہواؤں میں
چھپی ہوئی ہیں کئی بجلیاں گھٹاؤں میں

کہیں یہ قربِ قیامت نہ ہو، کہ سناٹا
سسک رہا ہے پرانی محلسراؤں میں

عروسِ حسن تو کھیتوں سے شہر کو چل دی
نہ بج سکی کوئی شہنائی میرے گاؤں میں

وہی بجھی ہوئی آنکھوں میں اُڑتی راکھ سہی
مگر گنو نہ جواں بیٹیوں کو ماؤں میں

ضمیرِ زندہ نہیں آفتابِ حشر سے کم
کہ بچ کے دھوپ سے، اب جل رہا ہوں چھاؤں میں

اب ایسے دَور کو واپس نہ لاؤ بہرِ خدا
گنے گئے تھے سلاطیں بھی جب خداؤں میں

نومبر
۱۹۷۲ء



جانے، کون رہزن ہیں! جانے، کون رہبر ہیں
گرد گرد چہرے ہیں، آئینے مکدّر ہیں

مجھ کو جبر لفظوں کا، بولنے نہیں دیتا
ورنہ جتنے صحرا ہیں، ریت کے سمندر ہیں

بیسویں صدی کیسا انقلاب لائی ہے
کوہ پر ببولیں ہیں، دشت میں صنوبر ہیں

جب سے ایک چڑیا نے شیر کو پچھاڑا ہے
فاختہ کی آنکھوں میں قاتلوں کے تیور ہیں

دائیں بائیں میرے ساتھ اک ہجوم رہتا ہے
دوستوں کی یادیں ہیں، دشمنوں کے لشکر ہیں

سوئے جسم و جاں دیکھوں، یا میں یہ سماں دیکھوں
پھول پھول ہاتھوں میں کیسے کیسے پتھر ہیں

بید زن کا لہجہ کچھ نرم پڑ گیا، ورنہ
مالک اب بھی مالک ہیں، چاکر اب بھی چاکر ہیں

سوت پہنے بیٹھے ہیں یہ جو فرشِ مرمر پر
نام کے قلندر ہیں، بخت کے سکندر ہیں

صبر کیوں دلاتے ہو، ضبط کیوں سکھاتے ہو
مجھ کو کتنی صدیوں کے یہ سبق تو ازبر ہیں

زندگی تھی جنّت بھی، زندگی تھی دوزخ بھی
داورا! یہ انساں کے دیکھے بھالے منظر ہیں

کرب میرے شعروں کا، انبساطِ فردا ہے
اشک جو ہیں آنکھوں میں، سیپیوں میں گوہر ہیں

فروری ۱۹۷۳ء

یار لوگ

بوم مزاجی یاروں کی
سب میری دیکھی بھالی
رات کی تاریکی میں
ان کی انگارہ سی آنکھیں — پوری!
دن کو اندھی اور ادھوری!
خالی!
دن کے یہ درویش مگر راتوں کے والی

اپنے محسن کو جب دن کے آئینے میں دیکھیں
فرطِ ادب سے سمٹیں، سکڑیں، جھک جائیں
اور کچلے، مسلے، روندے لہجے میں پوچھیں
کیسا ہے مزاجِ عالی؟ —
رات کو لیکن پیار کا رشتہ کاٹ کے نکلیں
جیسے بلّی کالی
ان کی ہے بس ایک نشانی — گالی!

مارچ ۱۹۷۳ء



تجھ سے ملتے ہی، بچھڑنا ترا یاد آتا ہے
ابر اُٹھتا ہے تو کوندا بھی لپک جاتا ہے

تیرے پیکر کا ہے ہر زاویہ محفوظ اِن میں
مجھ کو اپنے ہی خیالات پہ رشک آتا ہے

یہ تصرف ہے ترے حسن کا۔ یا عجز مرا
ایک چہرہ، کئی چہروں میں نظر آتا ہے

اتنی شدت ہے روایت سے بغاوت میں۔ کہ آج
آدمی پیار بھی کرتے ہوئے شرماتا ہے

عمر کا ہے یہ تقاضا، کہ زمانے کا مزاج
درد اُٹھتا ہے تو اب طیش بھی آجاتا ہے

میرا ہر قول گر آئینہ ہے اوروں کے لیے
میرا ہر فعل مجھے آئنہ دکھلاتا ہے

اس لیے وقت سا جابر بھی خدا بن نہ سکا
جب کوئی قبر میں اُترے تو یہ اِتراتا ہے

شانِ جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم، مرا ہر حکم بجا لاتا ہے

مارچ
۱۹۷۳ء



کہیں تُو میری محبت میں گھل رہا ہی نہ ہو
خدا کرے، تجھے یہ تجربہ ہُوا ہی نہ ہو

سپردگی مرا معیار تو نہیں، لیکن
میں سوچتا ہوں، ترے رُوپ میں خدا ہی نہ ہو

میں تجھ کو پا کے بھی کس شخص کی تلاش میں ہوں
مرے خیال میں کوئی ترے سوا ہی نہ ہو

وہ عذر کر، کہ مرے دل کو بھی یقیں آئے
وہ گیت گا، کہ جو میں نے کبھی سنا ہی نہ ہو

وہ بات کر، جسے پھیلا کے میں غزل کہہ لوں
سنا وہ شعر، جو میں نے ابھی کہا ہی نہ ہو

سحر کو دل کی طرف اک دھواں سا کیسا ہے!
کہیں یہ میرا دیا رات بھر جلا ہی نہ ہو

ہو کیسے جبرِ مشیّت کو اس دعا کا لحاظ
جو ایک بار ملے، پھر کبھی جدا ہی نہ ہو

یہ ابر و کشت کی دنیا میں کیسے ممکن ہے
کہ عمر بھر کی وفا کا کوئی صلہ ہی نہ ہو

مری نگاہ میں وہ پیڑ بھی ہے بد کردار
لدا ہُوا ہو جو پھل سے، مگر جھکا ہی نہ ہو

جو دشت دشت سے پھولوں کی بھیک مانگتا تھا
کہیں وہ توڑ کے کشکول، مر گیا ہی نہ ہو

طلوعِ صبح نے چمکا دیے ہیں ابر کے چاک
ندیم یہ مرا دامانِ مدعا ہی نہ ہو

مئی
۱۹۷۳ء



میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا — ایک ذرّہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے — کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

اے خدا! پھر یہ جہنم کا تماشا کیا ہے؟ — تیرا شہکار تو فی النّار نہیں ہو سکتا

اے حقیقت کو فقط خواب سمجھنے والے — تو کبھی صاحبِ اسرار نہیں ہو سکتا

تُو، جو اک موجۂ نکہت سے بھی چونک اُٹھتا ہے — حشر آتا ہے تو بیدار نہیں ہو سکتا

سرِ دیوار یہ کیوں نرخ کی تکرار ہوئی — گھر کا آنگن کبھی بازار نہیں ہو سکتا

راکھ سی، مجلسِ اقوام کی چٹکی میں ہے کیا! — کچھ بھی ہو، یہ مرا پندار نہیں ہو سکتا

اس حقیقت کو سمجھنے میں لٹایا کیا کچھ — میرا دشمن مرا غمخوار نہیں ہو سکتا

میں نے بھیجا تجھے ایوانِ حکومت میں مگر — اب تو برسوں ترا دیدار نہیں ہو سکتا

تیرگی چاہے ستاروں سے سفارش لائے — رات سے مجھ کو سروکار نہیں ہو سکتا

وہ جو شعروں میں ہے اک شے پسِ الفاظ ندیمؔ
اس کا الفاظ میں اظہار نہیں ہو سکتا

مئی ۱۹۷۳ء



میں ہوں تیرا کہ تُو شیدا میرا — بس یہ جھگڑا رہا تیرا میرا

کیا یہ کچھ کم ہے کہ دل توڑ کے بھی — تُو نے پندار نہ توڑا میرا

اک ترے حسن سے نسبت کے طفیل — لوگ تکتے رہے چہرہ میرا

چاند ڈوبا تو میں اُبھرا لیکن — تو نے رستہ ہی نہ دیکھا میرا

رو رہا ہوں، مگر آنسو کم ہیں — میرا سینہ ہے کہ صحرا میرا

اپنی فطرت میں تو ساون ہوں مگر — عمر بھر ابر نہ برسا میرا

زندہ ہونے کی ہوس لاکھوں میں — اور مصلوب مسیحا میرا

اک خدا ہے کہ اُترتا ہی نہیں — حشر صدیوں سے ہے برپا میرا

سُوئے خورشید سفر جرم نہیں — کیوں تعاقب میں ہے سایہ میرا
خون میں ڈوب کے، اے صبحِ وطن — رنگ کیسا نکھر آیا میرا

ہار جانا مری فطرت میں نہیں — رات اس کی ہے، ستارہ میرا
ڈوبنا سیکھ جو پایا ہے مجھے — میری گہرائی، کنارا میرا
شعر ہوتے ہی، نکل آتا ہے — آستیں سے یدِ بیضا میرا
دوست بھی چونک کے تکتے ہیں مجھے — میرا دشمن ہُوا چرچا میرا
میں تو مر جاؤں گا، لیکن یارو
کبھی آئے گا زمانہ میرا

جون
۱۹۷۳ء

بیسویں صدی کے نصفِ آخر کا انسان

آدمی سر برآوردہ ہے
پیٹ خالی ہے
آنکھیں خلائیں ہیں
ہونٹوں کے گوشوں میں پیاسیں ہیں
اُبھری ہُوئی پسلیوں میں کمانیں ہیں
اور استخواں ہاتھ ہیں
روح کی ایک دھجّی کا پرچم لیے
آدمی سر برآوردہ ہے

اگست
۱۹۷۳ء



اک بُت مجھے بھی گوشۂ دل میں پڑا ملا
واعظ کو وہم ہے کہ اُسی کو خدا ملا

حیرت ہے، اس نے اپنی پرستش ہی کیوں نہ کی
جب آدمی کو پہلے پہل آئنہ ملا

خورشیدِ زندگی کی تمازت غضب کی تھی
تو راہ میں ملا تو شجر کا مزا ملا

دیکھا جو غور سے تو مجسم تجھی میں تھا
وہ حسن جو خیال سے بھی ماورا ملا

سینے میں تیری یاد کے طوفان جب اُٹھے
ذہن اک بگولا بن کے ستاروں سے جا ملا

مجھ سے بچھڑ کے، یوسفِ بے کارواں ہے تُو
مجھ کو تو، خیر، درد ملا، تجھ کو کیا ملا

دن بھر جلائیں میں نے امیدوں کی مشعلیں
جب رات آئی، گھر کا دیا تک بجھا ملا

یارب، یہ کس نے ٹکڑے کیے روزِ حشر کے
مجھ کو تو گام گام پہ محشر بپا ملا

محکوم ہو کچھ ایسا کہ آزاد سا لگے
انساں کو دورِ نو میں یہ منصب نیا ملا

ماضی سے مجھ کو یوں تو عقیدت رہی، مگر
اس راستے میں جو بھی نگر تھا، لُٹا ملا

دشتِ فراق میں وہ بصیرت ملی، ندیم
جو مجھ سے چھن گیا تھا، وہی جابجا ملا

اگست
۱۹۷۳ء

چوگا

باجرے کا اک دانہ اپنی چونچ میں رکھے
چڑیا اماں چوگا دینے آئی ہے
بچے اتنے ننھے منے سے ہیں
جب وہ چیختے ہیں
سر سے پنجوں تک چونچیں بن جاتے ہیں
دانہ ایک اور بچے دس ہیں
چڑیا اماں کس کو چوگا دے
کس کس کی چونچ سے چونچ ملا کر ڈھارس دے

ذرّہ توڑ کے حشر بپا کرنا تو تم نے سیکھ لیا ہے
دانہ توڑ کے زندگی برپا کرنا اس سے اونچا فن ہے
کیا تم دانہ توڑ سکو گے؟
دانہ ایک اور بچے دس ہیں!

اگست
۱۹۷۳ء



فنا کی سمت ہے رُخ زندگی کے دھارے کا
مری نظر کو نہیں حوصلہ نظارے کا

ابھی کچھ اور بھی اصنام ڈھالے جائیں گے
کہ آدمی ابھی محتاج ہے سہارے کا

فضائے عصرِ رواں میں رچی ہے درندگی
غزال بھول گئے ہیں چلن طرارے کا

حیات، برف کے کہسار کھودنے میں کٹی
مجھے گماں سا ہوا تھا یہاں شرارے کا

میں اشک پونچھ تو لوں شب گزیدہ آنکھوں سے
میں منتظر ہوں تری صبح کے اشارے کا

گواہ ہے کہ کبھی ڈوبتا نہیں خورشید
بس اتنا کام ہے ظلمات میں ستارے کا

محبت ایک سمندر ہے، وہ بھی اتنا بسیط
کہ اس میں کوئی تصور نہیں کنارے کا

ندیمؔ، فن کے مجھے پینترے نہیں آتے
جو بات حق ہو تو کیا کام استعارے کا

اگست
۱۹۷۳ء

ابتلا

— سیلاب اگست ۱۹۷۳ء —

یہ کل کا تذکرہ ہے
جب میں اپنے کھیت کی، حدِ نظر تک پھیلتی وسعت کے اک گوشے میں
یوں استادہ تھا
جیسے عناصر میرے خادم ہوں
انھی نے میری خاطر چار جانب مخمل و دیبا بچھائے ہوں
اور اب یہ دست بستہ عرض کرنے وہ مری خدمت میں آئے ہوں
کہ ارشادِ گرامی ہو تو سستا لیں

"اجازت ہے"
شہنشاہوں کے لہجے میں یہ دو الفاظ کہ کر
میں نے اپنے ہاتھ دیکھے
جو عناصر کی لگامیں تھامتے ہیں، ہل چلاتے ہیں
بطونِ خاک سے رنگوں کی، مہکاروں کی جنت کھینچ لاتے ہیں

یہی وہ ہاتھ ہیں جن سے مری تخلیق کاری شعبدوں کی صف میں شامل ہے
یہ میرے ہاتھ ہیں
جن کی لکیریں میری مٹھی میں ہیں
اور تقدیر میری دسترس میں ہے

میں اک خلاق کی مانند کتنا مطمئن تھا
کتنا آسودہ تھا
اور شہکار میرا
دور تک پھیلا ہُوا
اپنی جوانی کے نشے میں لہلہاتا تھا، لچکتا تھا

اچانک یوں لگا — جیسے
غلاموں میں بغاوت ہو گئی ہو
پھر مرے سینے میں تیغِ آب اُتری
اور اتنی دور تک اُتری
کہ اس کی نوک میری پسلیوں میں سے گزر کر

ڈوبتے سورج کی شہ رگ کاٹتی
حدِ افق سے پار جا نکلی

یہ منظر دیدنی تھا
جب مری ہریالیاں میرے لہو سے تر بتر ہونے لگیں
اور میری مہکاروں میں لپٹے رنگ جڑ سے کٹ کے یوں بہنے لگے
جیسے زمیں روئیدگی اور زندگی کی میّتیں سینے سے چمٹائے
چلی ہو، آخری گردش کے پردے میں
حضورِ آفتاب اک آخری سجدہ ادا کرنے

یہ منظر دیدنی تھا
جب مری پتھرائی آنکھوں میں
کپاسی، نقرئی پھولوں نے گھُس کر
ان عناصر سے یہ پوچھا تھا —
تمہارے عدل کا یہ کون سا معیار ہے
انصاف کے آئین کی یہ کون سی شق ہے

یہ منظر دیدنی تھا
جب میں دلدل میں دھنسا تھا
اور اوپر آسماں پر، ہر طرف، کالی گھٹائیں خیمہ زن تھیں
اور بوندیں جب مری جانب لپکتی تھیں
تو چیلیں سی جھپٹتی تھیں
—"نہیں!"— میں نے کہا —"مرنے سے مَیں انکار کرتا ہوں!"
میں ابھرا پھڑپھڑا کر
اور ہزاروں دھجیاں میری انا کی
رہ گئیں دلدل کے پنجوں میں

یہ منظر دیدنی تھا
جب ادھورا جسم میرا
اجڑے پجڑے راستوں پر ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا تھا
دنیا کہہ رہی تھی —
یہ عجب انسان ہے، جو سر بریدہ ہے
مگر اس حشر میں بھی سرکشیدہ ہے!

اگست
۱۹۷۳ء



ببول کوہ پہ تھی، دشت میں صنوبر تھے
یہ تیرے عدل کے ماتھے پہ کیسے زیور تھے!
الٰہی! کس کے اشارے سے مجھ پہ ٹوٹ پڑے
وہ بے لگام عناصر، جو میرے چاکر تھے
ہوا چلی تو قیامت، گھٹا اٹھی تو بلا
یہ خاص قسم کے احساں ترے مجھی پر تھے
گرفتِ آب میں ہیں جن کی میتوں کے ہجوم
یہ آدمی ترے تاجِ شہی کے گوہر تھے
یہ رزق بانٹتے تھے اس بھری خدائی میں
بہت غریب، مگر کتنے بندہ پرور تھے

رواں دواں تھے مرے کھیت سطحِ دریا پر
عجیب فصل اُگی تھی، عجیب منظر تھے

اٹی ہوئی ہے جو ملبے سے، اس زمیں پہ کبھی
گھنے درخت تھے اور گونجتے ہوئے گھر تھے

میں شہرِ نغمہ و نَے میں پلٹ کے جب آیا
کراہتی تھیں چھتیں، اور سینہ زن در تھے

سزا ملی یہ ثمرور درخت بننے کی
کہ عمر بھر مری قسمت میں صرف پتھر تھے

عجیب شان سے نکلا تھا دوستوں کا جلوس
کہ پھول ہاتھ میں، اور آستیں میں خنجر تھے

فلک کی طرح بدلتی ہے روپ دھرتی بھی
سنا ہے، اب جو ہیں صحرا، کبھی سمندر تھے

میں جن کو چن کے اب اک آشیاں بناؤں گا
کبھی یہی خس و خاشاک میرے شہپر تھے

ندیم موسمِ باراں تو قتلِ عام سا تھا
کہ دستِ ابر میں بوندیں نہیں تھیں، نشتر تھے

سیلاب اگست
۱۹۷۳ء



کھڑا تھا کب سے، زمیں پیٹھ پر اٹھائے ہوئے
اب آدمی ہے قیامت سے لَو لگائے ہوئے

یہ دشت سے امڈ آیا ہے کس کا سیلِ جنوں
کہ حسنِ شہر کھڑا ہے نقاب اٹھائے ہوئے

یہ بھید، تیرے سوا، اے خدا، کسے معلوم
عذاب ٹوٹ پڑے مجھ پہ، کس کے لائے ہوئے

یہ سیلِ آب نہ تھا، زلزلہ تھا پانی کا
بکھر بکھر گئے قریے مرے بسائے ہوئے

عجب تضاد میں کاٹا ہے زندگی کا سفر
لبوں پہ پیاس تھی، بادل تھے سر پہ چھائے ہوئے

سحر ہوئی تو کوئی اپنے گھر میں رک نہ سکا
کسی کو یاد نہ آئے دئیے جلائے ہوئے

خدا کی شان، کہ منکر ہیں آدمیت کے
خود اپنی سکڑی ہوئی ذات کے ستائے ہوئے

جو آستینیں چڑھائیں بھی، مسکرائیں بھی
وہ لوگ ہیں مرے برسوں کے آزمائے ہوئے

وہ آدمی ہوں، کہ پیوندِ خاک ہو کر بھی
تنا رہوں گا، سرِ افلاک سے ملائے ہوئے

یہ انقلاب تو تعمیر کے مزاج میں ہے
گرائے جاتے ہیں ایواں بنے بنائے ہوئے

یہ اور بات، مرے بس میں تھی نہ گونج ان کی
مجھے تو مدتیں گزریں یہ گیت گائے ہوئے

مری ہی گود میں کیوں کٹ کے گر پڑے ہیں ندیم
ابھی دعا کے لیے تھے جو ہاتھ اُٹھائے ہوئے

سیلاب اگست
۱۹۷۳ء



کتنے بہت سے روپ ہیں حضرتِ آدمی کے بھی
ولولے داوری کے بھی، وسوسے کافری کے بھی

عشق جنوں سہی، مگر عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مطالبے عشق سے آگہی کے بھی

بت شکنی کا مرتبہ یوں تو بلند ہے، مگر
اپنے ہی خاص لطف ہیں صنعتِ آزری کے بھی

یوں تو سمیٹ شوق سے توشۂ آخرت، مگر
وہ جو ہیں زندہ، ان پہ کچھ قرض ہیں زندگی کے بھی

کیسے مرا فقیہِ شہر میری سمجھ میں آسکے
ڈھنگ قلندری کے بھی، رنگ سکندری کے بھی

یوں تو ہے شعر کا جمال، لفظ کا لَے سے اتّصال
میں نے چکھے ہیں ذائقے اس میں پیمبری کے بھی

ظلمتِ عمر کاٹ دی میں نے یہ سوچ کر ندیم
چادرِ شب میں جا بجا تار ہیں روشنی کے بھی

ستمبر
۱۹۷۳ء

○

جب ترا حکم ملا، ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا، کہ قیامت کر دی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا
لفظ سوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی

میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے
تُو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی

تجھ کو پُوجا ہے کہ اصنام پرستی کی ہے
میں نے وحدت کے مفاہیم کی کثرت کر دی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری اُلفت نے محبت مری عادت کر دی

پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کوچے کا پتہ
تیرے حالات نے کیسی تری صورت کر دی

کیا ترا جسم، ترے حسن کی حدّت میں جلا
راکھ کس نے تری سونے کی سی رنگت کر دی

ستمبر ۱۹۷۳ء

غرق ہو کر اُبھرنے کی ایک کہانی

سمندر کنارے کے اک گاؤں میں
کچھ عجب سی حکایات مشہور تھیں
ایک یہ تھی
کہ مدّت ہوئی
بط کی صورت کی اک سرخ کشتی
ہرے جنگلوں سے لدے اُس جزیرے کے ساحل سے نکلی
اِدھر زرد پھولوں کے فرغل میں لپٹے ہوئے اس جزیرے کی جانب
رواں تھی

یہ سب لوگ بارات لے کر گئے تھے
دلھن لے کے واپس چلے تھے
دلھن اُس مچھیرے کی بیٹی تھی جو بعد میں کفر بکتا ہُوا مر گیا تھا

یہ لڑکی مچھیرن تھی، پر ہو بہو جل پری تھی
کہ جو حسن اس کے لبوں، اس کی آنکھوں میں جھلمل جھلکتا تھا
جو حسن اس کے بدن میں تھا
جو حسن اس کی صدا میں تھا
جو حسن اس کی محبت میں تھا
آج تک اس سے انسان محروم ہیں

جب یہ کشتی
نفیری کی آواز میں لپٹی لپٹائی چلنے لگی
اور مچھیرن کے سینے میں
دولھا سے
(اک جبلت بھر کر)
لپٹنے کی خواہش مچلنے لگی
تو وہ طوفان آیا
جسے لوگ اب تک عناصر کا شہکار کہتے ہیں

پھر یوں ہُوا
جب یہ طوفاں تھما
دور افق تک فقط ہانپتا، ناچتا، موج در موج پانی تھا
اور کچھ نہ تھا

لوگ کہتے ہیں
وہ، جس نے طوفان بھیجا ہے
کشتی ڈبوئی ہے
اس پر بھی قادر ہے
اک روز کشتی ترا دے
سو مدت ہُوئی
صبح سے شام تک — شام سے صبح تک — لوگ افق تا افق —
اور کراں تا کراں دیکھتے ہیں
کہ شاید کسی موج نے اپنی قدرت دکھائی ہو
کشتی ابھر آئی ہو

چاندنی رات تھی
اور مَیں، اس حکایت سے مسحور
ساحل پہ بیٹھا
سمندر کی موجوں پہ، کرنوں کے خاکوں میں، وہ جل پری دیکھتا تھا
کہ جس کے لبوں اور آنکھوں میں جھلمل جھلکتا ہُوا حسن
انسان کے حسن سے مختلف حسن تھا
اور ابھی مجھ سے اس کے بدن اور اس کی صدا اور اس کی محبّت
کے سب رنگ سمٹے نہیں تھے
جب اک موج کا کوہسارِ گراں اپنی جانب رواں دیکھ کر میں اُٹھا
اور پلٹنے کو تھا
جب یہ کشتی نمایاں ہُوئی
(بط کی صورت کی اک سرخ کشتی)
جسے سطح پر، آخرِ کار، قدرت اُٹھا لائی تھی
یہ الگ بات ہے — اہلِ کشتی کو بھول آئی تھی

اکتوبر
۱۹۷۳ء

مجھے تلاش کرو

شجر سے ٹوٹ کے جب میں گرا، کہاں پہ گرا!
مجھے تلاش کرو
جن آندھیوں نے مری سرزمیں ادھیڑی تھی
وہ آج مولدِ عیسیٰ میں گرد اڑاتی ہیں
جو ہو سکے تو انہی سے مرا پتہ پوچھو
مجھے تلاش کرو
چلی جو مشرق و مغرب سے تند و تیز ہوا
مرے شجر نے مجھے پیار سے سمیٹ لیا
مجھے لپیٹ لیا اپنی کتنی باہوں میں
یہ بے لحاظ عناصر مگر بضد ہی رہے
میں برگِ سبز گرا برگِ زرد کی مانند

اسی سلگتی ہوئی راکھ سی پتاور میں
جو بجھ رہی ہے افق سے افق کے پار تلک
مجھے تلاش کرو
شجر سے کٹ کے زباں کٹ گئی نہ ہو میری
میں چیختا ہوں مگر حرفِ ناشنیدہ ہوں
حیاتِ تازہ ہے میری، شجر سے میرا ملاپ
کہ بس وہی مری بالیدگی کا منبع ہے
جو ریگزار میں چھتنار دیکھنے ہیں تمھیں
مجھے تلاش کرو
فلک کے راز تو کھلتے رہیں گے ہمنفسو!
مرے وجود کا بھی اب تو راز فاش کرو
مجھے تلاش کرو

نومبر
۱۹۷۳ء



میں دوستوں سے تھکا، دشمنوں میں جا بیٹھا
دکھی تھے وہ بھی، سو میں اپنے دکھ بھلا بیٹھا

سنی جو شہرتِ آسودہ خاطری میری
وہ اپنے درد لیے، میرے دل میں آ بیٹھا

بس ایک بار غرورِ انا کو ٹھیس لگی
میں تیرے ہجر میں دستِ دعا اٹھا بیٹھا

خدا گواہ کہ لٹ جاؤں گا، اگر میں کبھی
تجھے گنوا کے ترا در بھی گنوا بیٹھا

ترا خیال جب آیا تو یوں ہوا محسوس
قفس سے اڑ کے پرندہ شجر پہ جا بیٹھا

سزا ملی ہے مجھے گردِ راہ بننے کی
گنہ یہ ہے کہ میں کیوں راستہ دکھا بیٹھا

کٹے گی کیسے اس انجام ناشناس کی رات
ہوا کے شوق میں جو شمع ہی بجھا بیٹھا

مجھے خدا کی خدائی میں یوں ہوا محسوس
کہ جیسے عرش پہ ہو کوئی دوسرا بیٹھا

دسمبر
۱۹۷۲ء



یہ جب تیری مشیت ہے تو کیا تقصیر میری ہے
تری تحریر آخر کس لیے تقدیر میری ہے

گھٹا جب دن کو شب کر دے، تو وہ تیرا کرشمہ ہے
جب اس کا حاشیہ چمکے، تو یہ تنویر میری ہے

غبارِ راہ سے کیوں ہمسفر گھبرائے جاتے ہیں
یہ ہے میری ہی مٹی، اور دامن گیر میری ہے

میں اتنا بڑھ چکا ہوں کارزارِ خودشناسی میں
چلے گی جو مری گردن پہ، وہ شمشیر میری ہے

میں بعض آئینہ برداروں کے دل میں یوں کھٹکتا ہوں
وہ دیکھیں آئنہ، تو سامنے تصویر میری ہے

مری غزلیں ترے پیکر کی رعنائی کا پرتو ہیں
مرا فن حسن تیرا ہے مگر تشہیر میری ہے

دسمبر
۱۹۷۲ء



یہ کیا، کہ لمحۂ موجود کا ادب نہ کریں
اگر یہ شب ہے، تو کیوں لوگ ذکرِ شب نہ کریں

نہ جانے کفر ہے یہ، یا جنونِ استغناء
ترے فقیر خدا سے بھی کچھ طلب نہ کریں

ترے کمالِ بلاغت سے ہم کو شکوہ ہے
جو گفتگو تری آنکھیں کریں، وہ لب نہ کریں

یہ عرض ہے کہ مرے حال پر، مرے احباب
ترس جو کھانے چلے ہیں تو یہ غضب نہ کریں

کہیں وفا سرِ بازار بک نہ جائے ندیم
کہ اب تو لوگ محبت بھی بے سبب نہ کریں

دسمبر ۱۹۷۳ء

پسِ آئینہ

مجھے جمالِ بدن کا ہے اعتراف — مگر
میں کیا کروں کہ ورائے بدن بھی دیکھتا ہوں
یہ کائنات فقط ایک رخ نہیں رکھتی
چمن بھی دیکھتا ہوں اور بن بھی دیکھتا ہوں
مری نظر میں ہیں جب حسن کے تمام انداز
میں فن بھی دیکھتا ہوں، مکر و فن بھی دیکھتا ہوں
نکل گیا ہوں فریبِ نگاہ سے آگے
میں آسماں کو شکن در شکن بھی دیکھتا ہوں
وہ آدمی، کہ سبھی روئے جس کی میّت پر
میں اُس کو زیرِ کفن، خندہ زن بھی دیکھتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ خورشید ہے جلالِ مآب
مگر غروب سے خود کو رہائی دیتا نہیں

میں سوچتا ہوں کہ چاند اک جمال پارہ ہے
مگر وہ رُخ جو کسی کو دکھائی دیتا نہیں!

میں پوچھتا ہوں، حقیقت کا یہ تضاد ہے کیا
خدا جو دیتا ہے سب کچھ، خدائی دیتا نہیں

وہ لوگ ذوق سے عاری ہیں، جو یہ کہتے ہیں
کہ اشک ٹوٹتا ہے اور سنائی دیتا نہیں

بدن بھی آگ ہے اور روح بھی جہنم ہے
مرا قصور یہ ہے، میں دہائی دیتا نہیں

۱۹۷۴ء



مستقبل پڑھنے والے تصویر ہوئے
دیواروں پر نقش نئے تحریر ہوئے

خود ہی اپنے تیروں کے نخچیر ہوئے
اپنی ذات میں جتنے لوگ اسیر ہوئے

روح کے کہساروں سے لاوا اُبل پڑا
جب انساں، محرومِ نانِ شعیر ہوئے

کاش اُس گھر کی دیواروں میں در ہوتا
دیوانے جس گھر میں بے زنجیر ہوئے

دل کی اک اک ضرب پہ ہے تیشے کا گماں
اپنے لیے تو سانس بھی جُوئے شیر ہوئے

جب تک زندہ رہے ہم — تنہا زندہ رہے
خاک ہوئے تو سب کے دامن گیر ہوئے

ہر منزل پر پھیل گئیں امکاں کی حدیں
خواب ہمارے خوابوں کی تعبیر ہوئے

مسجد کے اندر مسجد تعمیر ہوئی
جذبے ٹھنڈے، سجدے بے تاثیر ہوئے

شعلۂ جاں کا پھول کھِلا صحرا صحرا
اپنی آگ میں جل کر ہم اکسیر ہوئے

اپنے دکھوں کا کوئی مداوا اب تو کرو
اب تو چاند ستارے بھی تسخیر ہوئے

ہفت افلاک کی برفیں کب پگھلیں گی ندیمؔ
اب تو سات سمندر آتش گیر ہوئے

۱۹۷۴ء

حمد

میں تیرا فن ہوں — یہی فن ترا غرور ہُوا
تری اَنا کا مری ذات سے ظہور ہُوا

ترے وجود کو وحدت ملی تو مجھ سے ملی
تو صرف ایک ہُوا، جب میں تجھ سے دور ہُوا

بس ایک حادثۂ کُن سے یہ جدائی ہوئی
میں ریگِ دشت ہُوا، تُو فرازِ طور ہُوا

ترے جمال کا جوہر مرا رقیب نہ ہو
میں تیری سمت جب آیا تو چُور چُور ہُوا

عجیب طرح کی اک ضد مرے خمیر میں ہے
کہ جب بھی تیرگی اُمڈی، میں نُور نُور ہُوا

یہ اور بات — رہا انتظار صدیوں تک
مگر جو سوچ لیا میں نے، وہ ضرور ہُوا

جون ۱۹۷۴ء

نفی

گل و گلزار جب مٹی سے اُگتے ہیں
تو ہم مٹی کے پُتلے سوچتے ہیں —
ہم تو بنجر ہیں!

گرفتِ سنگ سے جب بھی رہائی پا کے نکلا ہے خدا کوئی
ہمیں اِس وہم میں محصور پایا —
ہم تو پتھر ہیں!

کوئی ذرّاتِ زر جب چھانتا ہے ریگِ ساحل سے
تو ہم کہتے ہیں —
ہم تو ریت ہیں
تخلیق کے جوہر سے عاری ہیں!

کوئی جب چاند پر اپنے نقوشِ پا سجاتا ہے
تو ہم اس بحث میں مصروف ہوتے ہیں
کہ ہم تو خاک ہیں
اور اپنی فطرت میں نہ نوری ہیں نہ ناری ہیں!

ہم اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں
اور سمجھتے ہیں —
ہمارے دم سے سچ کا بول بالا ہے!

سبھی شمعیں بجھاتے جا رہے ہیں
اور کہتے ہیں —
ہمارے بعد اُجالا ہی اُجالا ہے!

جون
۱۹۷۴ء



میرے صحرا بھی ترے، میرا چمن بھی تیرا
میں بھی تیرا، مرا سرمایۂ فن بھی تیرا

اے مری راہ سے کترا کے نکلنے والے
مجھ کو تو یاد ہے بے ساختہ پن بھی تیرا

اجنبی سا کوئی بیٹھا مجھے بہلاتا ہے
چہرہ تیرا ہے، تو چہرے پہ دہن بھی تیرا

تیری سانسوں میں تو لفظوں کی چھپی ہیں گونجیں
یہ خموشی تو ہے اندازِ سخن بھی تیرا

روح کا حسن بھی دکھلا، کہ ادھورا نہ رہے
حسنِ صورت بھی ترا، حسنِ بدن بھی تیرا

ستمبر
۱۹۷۴ء

نعت

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے، یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

تہ بہ تہ تیرگیاں ذہن پہ جب ٹوٹتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیرا

کچھ نہیں سوجھتا جب پیاس کی شدت سے مجھے
چھلک اُٹھتا ہے مری روح میں مینا تیرا

پورے قد سے میں کھڑا ہوں، تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

دستگیری مری تنہائی کی، تُو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا، اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترے پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں، جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

تو بشر بھی ہے، مگر فخرِ بشر بھی تو ہے
مجھ کو تو یاد ہے بس اتنا سراپا تیرا

میں تجھے عالمِ اشیا میں بھی پا لیتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے عالمِ بالا تیرا

میری آنکھوں سے جو ڈھونڈیں، تجھے ہر سو دیکھیں
صرف خلوت میں جو کرتے ہیں نظارا تیرا

وہ اندھیروں سے بھی درّانہ گزر جاتے ہیں
جن کے ماتھے پہ چمکتا ہے ستارا تیرا

ندیاں بن کے پہاڑوں میں تو سب گھومتے ہیں
ریگزاروں میں بھی بہتا رہا دریا تیرا

شرق اور غرب میں بکھرے ہُوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا، ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا

اکتوبر
۱۹۷۴ء



عرش سے پار پہنچتی مری پروازِ خیال
ذہن میں گر نہ اُبھرتا تری خلوت کا سوال

ختم توفیقِ بغاوت فقط آدم پہ نہ کر
اب کسی اور بھی مخلوق کو جنّت سے نکال

رخ بدل اب تو ہوا کا، کہ زمانے بدلے
منتظر دشت ہیں کب سے، کہ چلے بادِ شمال

گھر سے ہر شخص نکلتا ہے شکاری بن کر
شہر میں جیسے چلے آئے ہوں صحرا کے غزال

دل نچڑتے ہیں، جگر کٹتے ہیں، سر گرتے ہیں
یہ تجارت کے مراکز ہیں کہ میدانِ قتال

میرے ہر درد کا انجام مرے علم میں ہے
اِک نئی صبح کا پیغام ہے سورج کا زوال

مجھ سے اک پل کی بھی تقویم مکمّل نہ ہوئی
کون رکھتا ہے محبت میں حسابِ مہ و سال

اِنھی دھبّوں کو جو نزدیک سے دیکھو تو بہشت
میری غزلیں ہیں سمندر میں جزیروں کی مثال

آج بھی ہے مرا محبوب وہی شخص ندیم
وقت کے ظلم سے مرجھا گئے جس کے خد و خال

اکتوبر
۱۹۷۴ء



میں اس فریب ہی میں رہا مبتلا سدا
ہر آشنا رہے گا مرا آشنا سدا

حیراں ہوں میں، یہ کون سا معیارِ عدل ہے
جو مجھ میں بس گیا، وہی مجھ سے جدا سدا

یوں مجھ پہ ٹوٹ ٹوٹ کے برسی ہیں رحمتیں
کٹ کٹ کے گر پڑا مرا دستِ دعا سدا

میں بولتا نہیں ہوں، مگر دیکھتا تو ہوں
لب میرے سِل چکے، مگر آنکھیں ہیں وا سدا

یارب، تو اوجِ عرش سے اترے تو یہ کہوں
اس عدل گہ میں مارا گیا بے خطا سدا

یہ زندگی تو جیسے فقط مشقِ مرگ ہے
میں تو غمِ حیات میں مرتا رہا سدا

مر جاؤں گا، کہ صرف خدا کو ثبات ہے
باقی رہے گا دہر میں حرفِ فنا سدا

صدیوں کے کارواں بھی کہیں آس پاس ہیں
کانوں میں گونجتی ہے صدائے درا سدا

سچا ہوں میں، کہ مجھ پہ مسلط ہے سچ کا خوف
لہرائے میرے سامنے یہ اژدہا سدا

کچھ آگے کفر ہے تو چلو کفر ہی سہی
کیوں نارسا رہے مری فکرِ رسا سدا

ہر حادثے کے بعد یہ الجھن رہی ندیمؔ
بندے سے بے نیاز رہا کیوں خدا سدا

اکتوبر
۱۹۷۴ء

○

کتنے سر تھے جو پروئے گئے تلواروں میں
گتنیاں دب گئیں تاریخ کے طوماروں میں

شہر ہیں یہ، کہ تمدّن کے عقوبت خانے
عمر بھر لوگ چُنے رہتے ہیں دیواروں میں

دن کو دیکھا غمِ مزدور میں گریاں اُن کو
شب کو جو لوگ سجے بیٹھے تھے درباروں میں

آپ دستار اُتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

آج بھی ملتے ہیں منصور ہزاروں، لیکن
اب انا الحق کی صلابت نہیں کرداروں میں

نہ کرو خلقِ الٰہی کی بُرائی کوئی!
دوستو! کفر نہ پھیلاؤ نمک خواروں میں

وہی ہر دور کے نمرود کے مجرم ہیں، جنھیں
پھول کھِلتے نظر آ جاتے ہیں انگاروں میں

حشر آنے کی ابھی تو کوئی تقریب نہیں
ابھی کچھ نیکیاں زندہ ہیں گنہگاروں میں

جو بھی آتا ہے وہ ہنستا ہُوا لُٹ جاتا ہے
بس گیا ہے کوئی آسیب سا بازاروں میں

انقلاب آنے سے پہلے کا یہ منظر ہے عجیب
دشت میں پھُول، بگولے ہیں چمن زاروں میں

رُت بدلتی ہے تو معیار بدل جاتے ہیں
بلبلیں خار لیے پھرتی ہیں منقاروں میں

میرے کیسے میں تو اک سُوت کی انٹی بھی نہ تھی
نام لکھوا دیا یوسف کے خریداروں میں

یوں تو کہنے کو بس اک بار ہی میں کڑکا تھا
دیر تک کون گرجتا رہا کہساروں میں

چُن لے بازارِ ہُنر سے کوئی بہروپ ندیمؔ
اب تو فن کار بھی شامل ہیں اداکاروں میں

اکتوبر
۱۹۷۴ء

تخلیقی لمحے کی دعا

خیالو!

مرے ذہن پر جب اُترنا

تو مٹی کی خوشبو بھی ہمراہ لانا

جو تخلیق کا جزوِ اعظم ہے

جس سے پیمبر بھی اُٹھے، مصوّر بھی، شاعر بھی، محبوب بھی، فلسفی بھی

وہی، جس کے جنگل، سمندر، پہاڑ اور صحرا فقط آدمیت کی خدمت

پہ مامور ہیں

جس پہ انسان نے اپنی محنت کے شہکار اُگائے ہیں

جس سے تمدّن نے، تہذیب و تاریخ نے

نام پائے ہیں

میں اس سے کٹ کر خلا میں گیا تو مرا وزن کھو جائے گا

اور مرا وزن مٹی سے ہے

اور میں مٹی سے ہوں

اور مٹی میں مجھ کو بدلنا بھی ہے

اے خیالو!

اسی مہرباں کی وہ خوشبو بھی ہمراہ لانا

جو انساں کو انساں بناتی ہے

عزّت سے جینا تو غیرت سے مرنا سکھاتی ہے

اور آخرِ کار — ماں بن کے، اپنے تھکے ماندے بچوں کو آغوش میں

لے کے گردش کا جھولا جھلاتی ہے!

نومبر
۱۹۷۴ء

نند*

— ایک نوحہ —

میرے صحرا میں وہ سب کچھ تھا جو منسوب ہے صحراؤں سے
دھوپ سے تپتی ہوئی ریت بھی
ٹیلوں کے پھپھولے بھی
جو تا حدِ نظر — تا بہ افق — تا بہ ابد پھیلے تھے
میرے صحرا میں فقط ایک ہی آواز بھی تھی —
سنّاٹے کی

اس کے باوصف میں زندہ تھا کہ تُو زندہ تھا
تو مری روح کے بنجر میں وہ چھتنار تھا
جو پیار کے پھولوں سے لدا رہتا تھا

آدمیت سے مرا عشق، تری چھاؤں میں پروان چڑھا
زندگی سے مرا رشتہ

* نندلال اینجہ۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست، جو ۵۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔

تری خوشبوئے مسلسل سے مہذب ٹھہرا
رُت بدلتی ہے تو پیڑوں کی جوانی بھی پتا ور میں بدل جاتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ رُت بدلی ہے، مجھ کو بھی بدلنا ہوگا
میں بھی بدلا ہوں، مگر یوں، کہ جو آنکھوں میں چمک تھی
وہ ستاروں کی طرح ٹوٹ کے دامن کو بھگو دیتی ہے
نند کہ کر جو مرے نطق میں اک شہد سا گھل جاتا تھا
بند ہونٹوں میں مقیّد ہے، کہ اب نند کی آواز پہ آواز نہیں آسکتی
اب وہ پُل ٹوٹ چکا ہے جو محبت کے کڑے فاصلے مربوط کیے رکھتا تھا

نند! تو حسن و محبّت تھا
رفاقت تھا
وہ سب کچھ تھا جو تُو نے مرے فن کو بخشا
کس طرح میں پسِ آفاق اکیلا تجھے جانے دیتا
میرے الفاظ کا مفہوم ترے ساتھ گیا

نومبر
۱۹۷۴ء

تحریر

ہوا لہروں پہ لکھتی ہے تو پانی ریت پر تحریر کرتا ہے
کہ ہم فرزندِ آدم کی طرح سب نقش گر ہیں
اہلِ فن ہیں
زندگی تخلیق کرتے ہیں

ستارہ ٹوٹ جاتا ہے
مگر بجھنے سے پہلے اپنی اس جگمگ عبارت سے فنا پر خندہ زن ہوتا ہے
— میں مٹ کر بھی آنے والے لمحوں میں درخشاں ہوں —

جو پتہ شاخ سے گرتا ہے
قرطاسِ ہوا پر، دائروں میں لکھتا آتا ہے
کہ شاخوں پر تڑپتے دوستو!
اگلی بہاروں میں مجھے پھر لوٹنا ہے، پھوٹنا ہے، ٹوٹنا ہے، خاک ہونا ہے
مگر وہ خاک، جو اشجار کی ماں ہے

وہ کوندا، جو گھٹا پر ثبت کر کے دستخط اپنے
بظاہر جا چکا ہوتا ہے
چھپ کر دیکھتا ہے
کس طرح تاریکیوں میں زلزلے آتے ہیں
منظر جاگ اُٹھتے ہیں

وہ جالا، جو پسِ در کتنے برسوں سے تنا ہے
اک صحیفہ ہے
کبھی سورج کی کرنوں میں اسے دیکھو
تو پوری کائنات اس میں مجسم پاؤ گے اور جھوم جاؤ گے

کتابیں پڑھنے والے تو نہ مانیں گے
مگر از خاک تا افلاک، جو کچھ بھی ہے، وہ تحریر ہے
الفاظ ہیں، اعراب ہیں، نقطے ہیں، شوشے ہیں، کششیں ہیں، دائرے ہیں، حرف ہیں
جن میں طلسمِ زندگی
اسرار کا اظہار کرتا ہے

نومبر
۱۹۷۳ء



مغرب کے افق پہ جو شفق ہے
چھو کر دیکھو تو خونِ حق ہے

اک عالمِ ہُو ہے اس سے آگے
دھرتی ہے کہ چودھواں طبق ہے

ابجد مرا اوّلیں سبق تھا
ابجد مرا آخری سبق ہے

بم کا ہُوا تجربہ زمیں پر
سینہ مگر آسماں کا شق ہے

شاعر ہو کہ حکمراں کہ صوفی
اس دَور میں سب کا رنگ فق ہے

تہذیب کشی کی آندھیوں میں
شیرازۂ فن ورق ورق ہے

نومبر ۱۹۷۴ء

لڑکیو!

لڑکیوں کے نام تو پیارے ہیں
لیکن صورتوں پر حسرتیں ہیں!
ان کی آنکھوں میں گھنی گہرائی ہے
لیکن یہ گہرائی فقط تنہائی ہے!
اور ان کے ہونٹوں پر جو روغن ہے
وہ پپڑایا ہُوا بنجر چھپانے کا جتن ہے

لڑکیو!
تم نوجواں ہو
اور شادابی کی اک ایسی علامت ہو

جو مٹ جائے تو پوری کائنات اک ایسے سناٹے میں گھر جائے
فرشتوں کو بھی جس میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہو

تمھیں کیا ہو گیا ہے، لڑکیو!
بے بات کی باتوں پہ ہنس دینے کی دولت کیوں گنوا بیٹھی ہو؟
پھولوں کو اداسے توڑنے اور بے خیالی میں مَسل دینے کی عادت
کیوں بھلا بیٹھی ہو؟
تم کس سوچ میں گم ہو؟

مسلسل سوچتی — اور اپنی سوچوں سے ہراساں لڑکیو!
اک پل اِدھر آؤ
مری آنکھوں سے دیکھو اپنی دنیا کو

زمیں بھیگی ہوئی ہے
آسماں نیلا ہے

سرخ اور سبز رنگت کے پرندے اُڑ رہے ہیں
جھاڑیاں پھولوں سے لد کر جھومتی ہیں
تیز جھونکے، سربلند اشجار کے پتّوں کے پہلو گدگداتے ہیں
تو پتّے ہنستے ہنستے ٹوٹ جاتے ہیں!

ابھی کچھ وقت ہے
سورج کے ڈھلنے میں ابھی دو چار پل — دو چار صدیاں
اب بھی باقی ہیں

نومبر
۱۹۷۴ء

بخدمتِ اقبال

جانتے ہیں، جو سمجھتے ہیں ترے فن کی زباں
تو نے دی روح کے کعبے میں محبت کی اذاں

مجھ کو اکثر ترا ارشاد ہی یاد آتا ہے
عشق کی شانِ حمیت کا چھڑے ذکر جہاں

آخر کار سرِ منزلِ عرفاں پہنچی
تیری چٹکی میں تھی جس ناقۂ دوراں کی عناں

چمک اُٹھتی ہے بلندی پہ تری پیشانی
جب کبھی پھیلنے لگتا ہے نشیبوں میں دھواں

جیسے شاخوں کا نمو، دھوپ میں گل بنتا ہے
خالقِ حسنِ بہاراں، ترا قلبِ سوزاں

جس قدر اُمتِ مسلم پہ کرم ہیں تیرے
اتنے ہی ملتِ آدم پہ ہیں تیرے احساں

عہدِ فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی
تیرے شعروں سے چنے جائیں گے اس کے عنواں

رومی و سعدی و غالب ہیں تری گونج سی ہے
جیسے صدیاں تجھے پانے میں رہیں سرگرداں

مجھ کو دعویٰ ہے، کہ اس دور کا شاعر ہوں، مگر
شعر کہتا ہوں تو یاد آتا ہے تیرا فرماں

"برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست
اے ز خود رفتہ، تہی شو ز نوائے دگراں" (اقبال)

نومبر
۱۹۷۴ء



میں ایک ذرّہ سہی، کائنات بھر میں رہوں
نظر نہ آؤں، کہ اک حلقۂ شرر میں رہوں

تمام دن رہے ایک اور شام کا دھڑکا
تمام رات میں اندیشۂ سحر میں رہوں

دعا یہ ہے مری غیرت پہ کوئی آنچ نہ آئے
اگر رہوں تو ترے حسن کے اثر میں رہوں

خدا کرے، مجھے دنیا تجھی سے پہچانے
تری نظر سے گروں یا تری نظر میں رہوں

میں اک دیا ہوں، مگر حوصلے ہیں سورج کے
ہوائے تند میں بھی تیری رہگزر میں رہوں

جو مجھ سے پیار نہیں، میرا انتظار ہے کیوں
نہیں ہوں دل میں، تو کیوں تیری چشمِ تر میں رہوں

بڑے سکون سے سو کر بھی جسم ٹوٹتا ہے
میں رات کو بھی کسی خواب کے سفر میں رہوں

بہت عجب مرا اندازِ خود فریبی ہے
کہ دشت دشت پھروں، اور اپنے گھر میں رہوں

ندیم، کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں

دسمبر
۱۹۷۴ء

عرفان کا حادثہ

ہوا نے بادلوں کو اس طرح تھپکا
کہ وہ جھونکوں کے ہاتھوں میں کھلونے بن گئے
اور آسماں پر اک محل اُبھرا

عجب مرمر تھا اس کا
جس پہ سورج کی شعاعوں کی بنت شہکارِ فن تھی
صدر دروازہ مقفل تھا
محل کی ساتویں منزل پہ لیکن
اک دریچہ وا نظر آیا
ابھی یہ چوکھٹا تصویر سے محروم تھا
لیکن دریچے سے اُدھر، اک پیکرِ رنگیں کا سایہ سا، ہیولا سا
اک آئینے میں جیسے محوِ آرائش تھا
لمحے — جن کو مستقبل میں آنا تھا

ابھی سے کتنی امیدوں کے گلدستے لیے
سج بن کے بیٹھے تھے دریچے میں

میں اپنی سانس روکے، آئینے کی اور دریچے کی مسافت میں بھٹکتا تھا
وہ لمحہ جو گزرنے کے لیے آیا تھا
میری ٹکٹکی سے ہل نہ سکتا تھا

سرِ دیوار اک بلّی، گلہری پر جو جھپٹی
میں نے دیکھا — اور فقط پل بھر کو دیکھا
پھر پلٹ کر آسماں پر جب نظر ڈالی
تو مرمر کا محل ٹوٹا پڑا تھا
اور ہوا نے، وا دریچے سے گزر کر، اس کی دیمک خوردہ دیواروں پہ
ماتم کے لیے اُٹھی ہوئی انگلی سے
میرا نام
تیرا نام
سب کا نام لکھا تھا

دسمبر
۱۹۷۴ء

دن آ گئے

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے

اب تو قدریں پگھلنے لگیں — اور معیار گلنے لگے
جو جواہر لہو سے ڈھلے — مٹھیوں سے پھسلنے لگے
جن کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے — اب وہی ہاتھ ملنے لگے
اب تو سورج اُترنے لگا — اور سائے تو ڈھلنے لگے
اب تو پتھر بھی مڑنے لگا — اب تو پربت بھی چلنے لگے
گرم صحراؤں کی کوکھ سے — سرد چشمے اُبلنے لگے

جو دلوں میں چھپے تھے دئے — اب تو آنکھوں میں جلنے لگے
وقت پیچھے کہیں رہ گیا — لوگ آگے نکلنے لگے
اوپر اوپر کا کیا تذکرہ — اندر اندر بدلنے لگے

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے

دسمبر
۱۹۷۴ء

افریقہ

دھرتی نے بدل لیا ہے محور
صحراؤں پہ برف گر رہی ہے
قطبین پہ ریت اُڑ رہی ہے
یورپ کے افق پہ — لڑکھڑاتی
اک فوج سیاہ سورجوں کی
گر گر کے غروب ہو رہی ہے
شب رنگ جبینِ افریقہ سے
اک صبح طلوع ہو رہی ہے
حبشی نے زمیں کی باگ تھامی
اعزازِ بنی سیاہ فامی

دسمبر
۱۹۷۴ء

کھیل اور کھلونا

کھلونے سے اگر وہ کھیلتے رہنے کی ضد کرتا ہے
اس کو کھیلنے دو
کھیلنے کے دن یہی ہوتے ہیں
جب بچّے کو صرف اک پھول مل جائے تو پورے باغ کی تضحیک کرتا ہے
ذرا سا ایک کانٹا اُس کی نازک جِلد کے خلیے کو مس کر لے
تو وہ اس طرح چلّاتا ہے
جیسے چھلنی چھلنی ہو چکا ہے
وہ اگر کہتا ہے — دانائی پہ صرف اُس کا اجارہ ہے
تو سچ کہتا ہے
دانائی کا رقبہ مختصر ہو تو اجارے کا کوئی دعویٰ بھی ناجائز نہیں ہوتا

یہ اُس کے کھیلنے کے دن ہیں
اُس کو کھیلنے دو
وقت آئے گا
کبھی کانٹوں پہ ننگے پاؤں چل کر، دشت کے پرلے افق پر کھلنے والے پھول
کی جانب ابد تک بڑھتا جائے گا

مگر اس کی جبیں پر بل نہ آئے گا
کبھی تاریخِ آدم کی سبھی دانائیاں سینے میں بھر کر بھی
اُسے اس کا تجسس اک نئی دانائی کا پیکر دکھائے گا
کھلونا خود بخود ہی ٹوٹ جائے گا

دسمبر
۱۹۷۴ء



در گزر کرنے کی عادت سیکھو
اے فرشتو، بشریت سیکھو

ربِ واحد کے پجاری ہو اگر
تم جو کثرت میں ہو، وحدت سیکھو

دشت، جو ابر کے محتاج نہیں
ان سے پیرایۂ غیرت سیکھو

ریزہ ریزہ ہی اگر رہنا ہے
اپنے صحراؤں سے وسعت سیکھو

صرف حیرت ہی نہیں آئنوں میں
ان سے اظہارِ حقیقت سیکھو

صرف رنگت ہی نہیں پھولوں میں
ان سے نکہت کی بھی حکمت سیکھو

ایک آنسو بھی نہ روکو دل میں
اور خوش رہنے کی عادت سیکھو

سامنے آنے سے کیوں ڈرتے ہو
عشق کرنا ہے تو شدت سیکھو

مجھ کو کیا علم ریا کے فن کا
مجھ سے سیکھو تو محبت سیکھو

درد ہی درد، مگر حسن ہی حسن
شاعرو، شعر کی سیرت سیکھو

جنوری
۱۹۷۵ء

فصیل

مکمل ہوگئی دیوار، تو معمار بولا :
اے مرے ہم قوم لوگو !
یہ فصیلِ شہر ہے
یہ سنگ و آہن سے بنی ہے
اور اس بے لوث خادم کا لہو بھی اس میں شامل ہے
میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا
صرف اِک چیز مانگوں گا
فقط اک توپ
جو دیوار پر رکھ کر سُوئے دشمن چلانی ہے
مجھے اس کے لیے، تم سے

تمھاری بیویوں کے زیوروں کی
اور تمھاری بیٹیوں کی چادروں کی
اور بچّوں کے کھلونوں کی ضرورت ہے

کروڑوں چادریں اُتریں
ہزاروں زیوروں، لاکھوں کھلونوں میں وہ گھِر کر رہ گیا
پھر یوں ہُوا —
اور پر فضا سے، ایک چڑیا یک بیک دیوار پر اُتری
تو سب کچھ ڈھیر تھا !
اور قوم کے ایثار کے انبار پر معمار چڑھ کر سوچتا تھا
— جب شکستہ ہو چکی دیوار
پھر دشمن، پسِ دیوار، کیوں محتاج ہے میرے اشارے کا !

جنوری
۱۹۷۵ء



کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مرا تنہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں یک جا ہونا

سرِ صحرا تو عناصر بھی بھٹک جاتے ہیں
اس سفر میں کسے راس آئے گا دریا ہونا

کیسے بھولوں وہ شبِ ہجر کے سناٹے میں
خشک پتے کا بھی گرنا تو دھماکا ہونا

میرے آتے ہی، ترے رنگ کے فق ہونے سے
میں نے دیکھا ہے بھری بزم کا صحرا ہونا

تُو جو چاہے تو اسے اپنا مقدّر کہ لوں
ساتھ انبوہ کے چلتے ہُوئے تنہا ہونا

ایک گلزار سے میں راکھ میں بدلا، لیکن
ابھی باقی ہے قیامت کا تماشا ہونا

ایک نعمت بھی یہی، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا

جو برائی تھی، مرے نام سے منسوب ہُوئی
دوستو! کتنا بُرا تھا مرا اچھا ہونا

قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرومِ تمنّا ہونا

شاعری روزِ ازل سے ہُوئی تخلیق ندیم
شعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا

فروری
۱۹۷۰ء

○

زخمِ نگاہ کے لیے مرہمِ اندمال تھے
تیرے گھٹا سے بال تھے، تیرے شفق سے گال تھے

رات عجیب رات تھی، ہم تھے خدا کی ذات تھی
چاند بھی زرد زرد تھا، تارے بھی خال خال تھے

شرک سہی، مگر یہی اوجِ سجود ہی نہ ہو
لب پہ خدا کا نام تھا، دل میں ترے خیال تھے

اب تری انجمن میں کیوں اجنبی اجنبی سے ہیں
ہم جو ترا شعور تھے، ہم جو ترا جمال تھے

ہم کو ترے غرور نے کم سخنی کی مار دی
ایسا جواب دے دیا، جس میں کئی سوال تھے

تیرا اداس التفات دل کی زمیں نہ چھو سکا
کتنی نحیف تھی کرن، کتنے گھنے ملال تھے

تو نہ ملا، مگر ہمیں دولتِ ہجر مل گئی
ہم جو تباہ حال تھے، درد سے مالا مال تھے

کیسا یہ انقلاب تھا، طفل کا جیسے خواب تھا
پریوں کے لب سیاہ تھے، لاشوں کے ہونٹ لال تھے

ہم پہ بہ فیضِ بے دلی ایسے بھی وقت آئے ہیں
آنکھ نہ تھی عذاب تھی، سانس نہ تھے وبال تھے

عشق کی ابتدا کا دور کتنا عجیب تھا ندیم
لطف بھی بے نظیر تھے، کرب بھی بے مثال تھے

فروری
۱۹۷۵ء

خدا سے ایک سوال

تمام عمر، کسی کوزہ گر کے چاک پہ ہم
بگڑتے بنتے رہے، صورتیں بدلتے رہے

تمام عمر، سرِ راہِ انتظارِ جمال
چراغِ عشق بنے، تیرگی میں جلتے رہے

تمازتوں سے جگر بھن گئے، مگر ہم لوگ
سروں پہ برف کے تودے اٹھائے، چلتے رہے

ہماری موت میں بھی جشن کے سے تیور تھے
مثالِ شمع چمکتے رہے، پگھلتے رہے

تمام عمر محبت کا احترام کیا
تمام عمر بہشتوں سے ہم نکلتے رہے

الٰہی! یہ تری حکمت بھی، تیرا راز بھی ہے
مجھے بس اتنا بتا — اس کا کچھ جواز بھی ہے

مارچ ۱۹۷۵ء



نہ دل میں درد، نہ آنکھوں میں نورِ ربطِ قدیم
زمین کے بھی ہیں کچھ لوگ آسماں پہ مقیم

میں کس ثبوت پہ الزام یہ خدا پہ دھر دوں
لکھے نصیب، تو انساں بھی کر دیے تقسیم

نہ اقتدار، نہ شہرت، نہ زہدِ شبِ بیدار
کمالِ قلب و نظر ہے جمال کی تفہیم

ہو عقل سر بگریباں، تو عشق کون کرے
دلوں کا ذکر ہی کیا جب دماغ ہوں دو نیم

زمیں پہ سانس بھی لینا، پہاڑ کاٹنا ہے
مجھے خدا کی قسم ہے کہ آدمی ہے عظیم

میں نارِ جبر میں جل کر بھی مسکراتا ہوں
کہ میں اس آگ میں گلزار دیکھتا ہوں ندیم

مارچ ۱۹۷۵ء



کیوں ایک ہی بار آپ انھیں رخصت نہیں کرتے
محنت کا جو پھل کھاتے ہیں، محنت نہیں کرتے

جس پر کسی حق دار کا حق ہم سے سوا ہو
ہم ایسی کسی چیز کی حسرت نہیں کرتے

اے دل، تجھے انجام کی کیا فکر پڑی ہے
ہم عشق کی دنیا میں سیاست نہیں کرتے

ہر ظلم کے منہ پر ہمیں سچ کہنے کی لت ہے
ہم لوگ تو ظالم کی بھی غیبت نہیں کرتے

جو دیکھ چکے ہیں شفقِ شام کا منظر
چڑھتے ہوئے سورج کی عبادت نہیں کرتے

اس عہد کے صحرا میں غزالانِ جواں سال
زنجیر بھی بجتی ہو تو وحشت نہیں کرتے

دیوارِ گلستاں پہ بھی جبر کے پہرے
غنچے بھی تو کھلنے کی جسارت نہیں کرتے

بیزار رہیں جو جذبۂ حب الوطنی سے
وہ لوگ کسی سے بھی محبت نہیں کرتے

مئی
۱۹۷۵ء

محنت کش لڑکیاں

(کھیتوں میں کام کرنے والی چینی لڑکیاں دیکھ کر)

یہ لڑکیاں ہیں، تو خیّاط نے لباس اُن کا
کہیں سے بھی تو دبایا نہیں، اُبھارا نہیں
ڈھنپی ہوئی ہیں کچھ ایسے کہ ناریل جیسے
جسے شجر سے کسی ہاتھ نے اُتارا نہیں
تمام رس ہے، مگر ذائقے کو کیا معلوم!
کوئی اشارہ نہیں، کوئی استعارہ نہیں

سمندروں کی سی آنکھیں، ستاروں کی سی جبیں
مگر یہ حسن تو آئینہ دیکھتا ہی نہیں
چلیں تو اپنی اَنا کا حصار کھینچتی جائیں
جھکیں تو جیسے زمیں پر فلک کا فرش بچھائیں
لبوں پہ رنگ ہیں کوئی، نہ رخ پہ غازے ہیں
یہ لڑکیاں ہیں کہ تاریخ کے تقاضے ہیں!

جون ۱۹۷۲ء



پسِ شفق تو مجھے خونِ جگر نظر آئے
غروب ہوتا ہُوا اک بشر نظر آئے
میں کس زباں سے گھر کو گھر کہوں، کہ مجھے
صدف صدف میں ہجومِ شرر نظر آئے
میں جب بھی عالمِ حیرت میں آئنہ دیکھوں
ہزار نیزوں پہ اپنا ہی سر نظر آئے
عجیب پیشہ وری کے عجیب تر معیار
جو سنگ زن ہے وہ آئینہ گر نظر آئے
زمیں سے پیچھے کہیں رہ گئے مرے دیہات
وہاں تو آج بھی دورِ حجر نظر آئے
جو سطح پر ہی رہا، فاضلِ اجل ٹھہرا
جو تہ میں ڈوب گیا، بے خبر نظر آئے

وہی خدا، کہ جو افلاک سے اترتا نہیں
اُسی کا عکس مجھے خاک پر نظر آئے

برا نہ مانے اگر محتسب، تو عرض کروں
مجھے کلوں میں فرشتوں کے گھر نظر آئے

میں جب بھی فکر کے پر تول کر روانہ ہُوا
فلک کے گنبدِ بے در میں در نظر آئے

ہبوطِ آدم و حوا پہ جب بھی غور کروں
تو کہکشاں مجھے گردِ سفر نظر آئے

کبھی تو پونچھ کے آنسو بھی دیکھ دنیا کو
کہ چشمِ تر سے تو بس چشمِ تر نظر آئے

مرے نصیب میں چھاؤں اگر نہیں، نہ سہی
کڑکتی دھوپ میں دُور اک شجر نظر آئے

ندیم میری رجا کا علاج ہے شاید
کہ دل جلے تو طلوعِ سحر نظر آئے

جولائی
۱۹۷۵ء



نہیں جو حسن فقط فتنہ گر نظر آئے
مجھے تو عیب بھی اس کا، ہنر نظر آئے

وہ ایک لمحۂ رخصت محیطِ وقت ہُوا
گزر گیا، مگر آٹھوں پہر نظر آئے

جسے بھی دیکھوں، ترے خد و خال میں دیکھوں
جدھر بھی جاؤں، تری رہگزر نظر آئے

تمام عمر کی تنہائی کے عوض، یا رب
وہ ایک پل کو ملے، لحظہ بھر نظر آئے

میں جس قدر بھی اسے بھولنے کی فکر کروں
فضائے فکر میں وہ اُس قدر نظر آئے

ہُوئی جو شام، تو سائے نے ساتھ چھوڑ دیا
جو شب کٹے تو مرا ہمسفر نظر آئے

جو دُور سے نظر آئے لدے لدے سے ندیم
قریب سے وہ شجر بے ثمر نظر آئے

جولائی
۱۹۷۵ء

کیا ہُوا!

اس نے کہا کہ میری طبیعت پہ بوجھ ہے
میں سوچنے لگا کہ خدا جانے کیا ہُوا!

اتنی سی سوچ سے مری دنیا بدل گئی
وہ حسن جو ابھی سرِ راہے نظر پڑا
کیسا لٹا لُٹا یا کھنڈر سا مجھے لگا

آنکھوں کے نیل ہوں کہ بھنوؤں کے حریم ہوں
گالوں کی روشنی ہو کہ بالوں کی تیرگی
سینے کے عزم ہوں کہ بدن کی امنگ ہو

سب لفظ اپنی دولتِ مفہوم کے بغیر
پانی میں جیسے عکس ابابیل کا پڑے

جولائی
۱۹۷۵ء



صحرا ہوں، مجھے چمن بنا دے — ہونٹوں پہ گلاب سے کھلا دے
میں دُور ہوں، سن سکوں تو کافر — تُو تجربتہً مجھے صدا دے
اظہار، نماز ہے وفا کی — توفیق اگر تجھے خدا دے
یہ تیرا بدن ہے، یہ مرے لب — اب پردۂ معرفت اُٹھا دے
توقیرِ جمالِ عام کر کے — یا رب، مجھے عشق کا صلہ دے
اس شان سے آئے موسمِ گل — ویرانوں میں آگ سی لگا دے
میں حبس پسند ہو رہا ہوں — جھونکا، ترا نقشِ پا مٹا دے
چھٹتی نہیں عمر بھر کی عادت — اب وصل بھی ہجر کا مزا دے
تہذیب ہے عشق کی انوکھی — دل دُکھتا رہے، مگر دعا دے
بجھ جائے دیا، تو دے اندھیرا — اور بجھ نہ سکے تو گھر جلا دے
تو کہہ نہ سکے جو اپنے دل کی — میری ہی غزل مجھے سنا دے

یوں اس نے ندیمؔ مجھ کو دیکھا
جیسے کوئی راستہ دکھا دے

جولائی
۱۹۷۵ء

شاعری

کتنے انوکھے شاعر ہو
ماں سے بھی نفرت کرتے ہو
حسن و جمال میں لپٹا ہوا
جب کوئی منظر دیکھتے ہو!
کتنی عجیب رعونت سے
اپنے شعر میں کہتے ہو:

سبزہ، پھول، ندی، بادل
سب کچھ غیر یقینی ہے
خوشبو روشن روشن ہے
روشنی بھینی بھینی ہے
کتنا لطیف ہے یہ منظر
کتنا غیر زمینی ہے

اگست
۱۹۷۵ء

نئی بارش

بارش رکی تو پیڑ نے تھاما ہوا کا ہاتھ
بولا — کہ اے حسینۂ تجسیمِ صوت و رقص
بوندوں کے نغمہ ریز تسلسل نے ٹوٹ کر
میرے شگفتہ خواب کو ویران کر دیا
روٹھی ہوئی گھٹا کو منا لا، کہ میں غریب
سورج کی حدتوں کا ہدف پھر نہ بن سکوں

کہنے لگی ہوا — مرے ہمدم، ترا وجود
احساس ہو تجھے تو گھٹاؤں سے کم نہیں
پہروں تک ابر تجھ پہ برستا رہا، مگر
اب اس میں ایک بوند برسنے کا دم نہیں
آئینۂ فضا میں ذرا اپنا عکس دیکھ
پتہ وہ کون سا ہے جو اس وقت نم نہیں

یہ کہہ کے اس طرح سے چھڑایا ہوا نے ہاتھ
پیڑ ایک بُت کی طرح سے پتھرا کے رہ گیا
پھر بے بسی سے، سُوئے فلک دیکھنے لگا
ناگاہ اک لطیف سے جھونکے سے، برگ برگ
خود اپنے پیڑ کی بشریت پہ ہنس پڑا
بوندوں کا اِک ہجوم زمیں پر برس پڑا

اگست
۱۹۷۵ء



تیرے لبوں کی سرخی، میرے لہو جیسی تھی
میں نے انوکھی، لیکن سچی بات کہی تھی
کل جب تیرے آنے میں کچھ دیر ہوئی تھی
میں نے زمیں کی گردش کی آواز سُنی تھی
تیرے چہرے کا وہ منظر کیسے بھُولوں؟
دل ڈوبا تھا اور شفق سی پھُول رہی تھی
تیرے پیار نے وقت کی تقویمیں ہی بدل دیں
پل پل میں ایک ایک صدی سمٹی بیٹھی تھی
ساری دنیا دھوپ میں تھی، میں سائے میں تھا
تیری یاد، گھٹا کی صورت امڈ پڑی تھی
پتّے ناحق اُس کے دُکھ پر تڑپ رہے تھے
چڑیا خوشی خوشی بارش میں بھیگ رہی تھی

وقت کی بولی، لفظوں کی محتاج نہیں ہے
شب جتنی خاموش تھی، اُتنی بامعنی تھی

رات کی ٹھوڑی تارا، ماتھے چاند کا جھومر
افریقہ کی بیٹی دُلہن بنی کھڑی تھی

صرف اِس بات پہ کوندے لپکے، بادل کڑکے
دیا جلانے کیوں لڑکی مسجد کو چلی تھی

جب بھی مَیں ماضی سے روشنی لینے پہنچا
بجھے ہُوئے چولھوں سے نکل کر راکھ اُڑتی تھی

ہر پیارا چہرہ جانا پہچانا سا تھا
جیسے یہ صورت پہلے بھی کہیں دیکھی تھی

کاش ندیم خدا کو کوئی یاد دلا دے
برسوں پہلے میں نے ایک تمنا کی تھی

اگست
١٩٧٥ء

انسان اور آسمان

کوئی ارض و سما کے راز مجھ سے کہنے لگتا ہے
سحر کا نور جب پگڈنڈیوں پر بہنے لگتا ہے

مرا ذوقِ نظر پرواز کی کرتا ہے تیاری
اُبھرتی ہے افق پر جب افق کی نقرئی دھاری

کئی یادوں کی کتنی دلہنیں سج بن کے آتی ہیں
گھنے اشجار میں جب چھپ کے چڑیاں چہچہاتی ہیں

رسائی حدِ امکاں سے نکل کر گنگناتی ہے
اذاں جب صحنِ مسجد سے سُوئے آفاق جاتی ہے

اگرچہ درمیاں ہیں فاصلے لاکھوں زمانوں کے
ابھی قائم ہیں انسانوں سے رشتے آسمانوں کے

ستمبر ١٩٧٥ء



جی چاہتا ہے، فلک پہ جاؤں — سورج کو غروب سے بچاؤں

بس میرا چلے جو گردشوں پر — دن کو بھی نہ چاند کو بجھاؤں

میں چھوڑ کے سیدھے راستوں کو — بھٹکی ہوئی نیکیاں کماؤں

امکان پہ اس قدر یقیں ہے — صحراؤں میں بیج ڈال آؤں

میں شب کے مسافروں کی خاطر — مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں

تنہائی ہے، عمر کا سفر ہے — دشمن ہی کو ہمسفر بناؤں

یہ بھی تو نماز کی قضا ہے — جو روٹھ گئے، انھیں مناؤں

جب مجھ کو تلاش ہے خدا کی — آفاق میں کس طرح سماؤں

اشعار ہیں میرے استعارے
آؤ تمھیں آئنے دکھاؤں

یوں بٹ کے، بکھر کے رہ گیا ہوں — ہر شخص میں اپنا عکس پاؤں

آواز جو دوں کسی کے در پر — اندر سے بھی خود نکل کے آؤں

اے چارہ گرانِ عصرِ حاضر — فولاد کا دل کہاں سے لاؤں

ہر رات دعا کروں سحر کی — ہر روز نیا فریب کھاؤں

ہر جبر پہ صبر کر رہا ہوں — اس طرح کہیں اجڑ نہ جاؤں

گھر ڈوب رہے ہیں تیرگی میں — قبروں پہ مگر دیے جلاؤں

رونا بھی تو طرزِ گفتگو ہے — آنکھیں جو رکیں تو لب ہلاؤں

ماحول ہی سازگار کب تھا — حسرت ہی رہی کہ مسکراؤں

خود کو تو ندیم آزمایا
اب مر کے خدا کو آزماؤں

اکتوبر
۱۹۷۵ء

تاریخ کا موڑ

پہاڑی قصر کے مرمر کے زینے پر کھڑے ہو کر
وہ نیچے وادیوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی
حدِ نظر تک منتشر مخلوق سے
اپنی رُندھی آواز میں کہنے لگا :
—" اب مملکت میں ہر طرف تہذیب کا سکہ چلے گا
آج سے ہر آدمی اک دیوتا ہے
محترم ہے
اور مقدس ہے
ہماری مملکت کے پاسبانو !
قصرِ شاہی کے ستونو !

دوستو !
اک دوسرے کو پوجنا سیکھو
اسی پوجا میں وہ معراجِ انسانی ہے
جس کے اَن گنت دانش وروں نے خواب دیکھے ہیں
یہی پوجا
یہی اک دوسرے سے پیار
وہ تہذیب ہے
جس کے تحفظ کے لیے قوموں نے قوموں کو مٹایا ہے
زمیں پر ٹوٹے پھوٹے استخواں کا اک عجائب گھر سجایا ہے
لہو کا
جیتے جیتے، گرم اور روشن لہو کا
مشرق و مغرب میں وہ سیلاب آیا ہے
جسے تہذیب کے الفاظ میں تاریخ کہتے ہیں
ہمارے عہدِ زرّیں میں

کئی صدیوں کی یہ قربانیاں وہ رنگ لائی ہیں
کہ اب ہر آدمی اک دیوتا ہے
محترم ہے
اور مقدس ہے —"

"مقدس!"
یک بہ یک حدِ نظر تک پھیلتے انبوہ میں سے اک صدا آئی:
"اگر میں دیوتا ہوں
محترم ہوں
اور مقدس ہوں
تو اے مرمر کے زینے پر کھڑے جم جاہ!
اے تہذیب کے ماتھے کے تارے!
اے مری تاریخ کے عنواں!
بلندی سے اتر کر مجھ کو مٹی سے اُٹھا

اور میری پوجا کر!"

مورّخ متفق ہیں اور کہتے ہیں
کہ پھر کچھ یوں ہُوا
وہ، جس نے پوجا کے لیے جم جاہ کو دھرتی کی پستی میں بلایا تھا
تڑپتا جا رہا تھا
اور اپنے خون سے تاریخِ آدم کا نیا عنوان لکھتا جا رہا تھا!

اکتوبر
۱۹۷۵ء

بارشوں کے موسموں میں

مجھے کچی چھتوں پر
بارشوں کے موسموں میں
پیار آتا ہے

برستی ہے گھٹا تو اس طرح محسوس ہوتا ہے
عناصر — آدمی کے سامنے ہتھیار ڈالے
ہاتھ باندھے
زیرِ لب — شاید — رفاقت کے ترانے گنگناتے ہیں

مجھے اُس وقت یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے آسماں سے
میری چھت پر
زندگی کا درس لینے کے لیے
کمسن فرشتے ان گنت تعداد میں اُترے ہیں

اور کل کا سبق دہراتے پھرتے ہیں

مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ بارش ایک رقاصہ ہے
جس کے پاؤں میں بوندوں کے گھنگھرو ہیں
وہ چھت پر
پوری چھت پر
ناچتی پھرتی ہے
اور اِس چھت کی کڑیاں بج رہی ہیں تال دینے کو

مگر جب بارشیں، کچی چھتوں کے ناتواں جسموں میں اپنا زہر پھیلاتی ہیں
اور اس آسمانی بوجھ سے شیرازۂ تعمیر کو مقراض بن کر کاٹتی ہیں
میں نے دیکھا ہے
کہ اُس پل بھی
مجھے کچی چھتوں پر پیار آتا ہے

اکتوبر
۱۹۷۵ء



وفا میری — متاعِ ناخریدہ　　دعا میری — صدائے ناشنیدہ

خدا کو دیکھ لینا چاہتا ہوں　　"شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ"

مجھے لمسِ بدن سے رکھ نہ محروم　　نہیں میں اس قدر بھی برگزیدہ

ابھی آدم فلک سے گر رہا ہے　　ابھی انسان ہے ناآفریدہ

ذرا آہستہ چل، اے بادِ حالات　　بہت نازک ہے نسلِ نودمیدہ

یہ ہے تہذیب یا آشوبِ تہذیب　　بدن ہیں پُرسکوں، روحیں دریدہ

شعور اُن کا ذرا بیدار ہو لے　　اُڑیں گے طائرانِ پربریدہ

گھروں میں تھے وہی سر در گریباں　　سرِ بازار تھے جو سرکشیدہ

وہ جس کی آدم آزاری ہے مشہور　　وہی ابلیس ہے آدم گزیدہ

زوالِ شب کا نوحہ لکھ رہا ہوں
سحر کا بنتا جاتا ہے قصیدہ

نومبر
۱۹۷۵ء



نہ سہی اور کہیں گھر میرا　　دشت میرا ہے، سمندر میرا

اپنے کشکول میں اک پھول لیے　　میرا ہمزاد ہے رہبر میرا

یہ زمیں ہے کہ فقط عکسِ زمیں　　میرا سایہ ہے کہ پیکر میرا

یا تو چہرے ہی بدل کر بگڑے　　یا ہے آئینہ مکدر میرا

کٹ کے بھی، گر کے بھی، نیزے پر بھی　　میری گردن پہ رہا سر میرا

روز پرکھا ہے خدا کو میں نے　　روز برپا ہوا محشر میرا

اپنے ماضی کے پرستاروں میں　　رائیگاں جائے گا جوہر میرا

اے مرے ذہن کے کھلتے ہوئے در　　دل ہوا جاتا ہے کافر میرا

جراَتِ فکر کی بحثوں میں ندیمؔ
نام لیتے ہیں سخن ور میرا

دسمبر
۱۹۷۵ء

ا — ب

ذہین بچّو!

"ا" سے آم اور "ب" سے بکری کے دن گئے

اب "ا" سے ایٹم پڑھو، کہ ایٹم اٹل ہے

اب "ب" سے بم بنے گا

کہ بم ہی آج اور بم ہی کل ہے

حروف جیسے بھی تھے، وہی ہیں

مگر جو رشتے تھے ان میں — یکسر بدل چکے ہیں

حروف کے اتحاد سے وہ جو لفظ بنتے تھے

ان کے مفہوم عہدِ نو کے جدید سانچوں میں ڈھل چکے ہیں

محبّت — اسلوب ہے

جمال — ایک جنس ہے

اور وفا — اک ایسا معاہدہ ہے

جسے ابھی چاک چاک ہونا ہے

حرف روتے ہیں

اپنی بے حرمتی پہ روتے ہیں — چیختے ہیں

مگر سماعت سے ماورا ہیں

کہ نیک استاد کی صدا گونجتی ہے ہر سُو:

ذہین بچّو!

"ا" سے ایٹم ہے

"ب" سے بم ہے

پڑھو — کہ ایٹم اٹل ہے

بم کائنات کا آج اور کل ہے

دسمبر
۱۹۷۵ء

○

پھول بھی کاغذ کے ہیں، مانگے کی ہے مہکار بھی
فصلِ گل نے میرا دل رکھا ہے اب کی بار بھی

منتظر ہوں مَیں ترے پندار کے انجام کا
جب ترے پاؤں سے اُلجھے گی تری دستار بھی

کیا عجب، گر دائرے کو توڑ کر نکلا ہوں میں
چلتے چلتے ٹوٹ جاتا ہے خطِ پرکار بھی

در مرے کچے گھروندے کا، ہوائیں لے اُڑیں
پھر پڑا چھینٹا تو آدھی رہ گئی دیوار بھی

آنگنوں کے امن کو کیوں کھا گئیں محبوسیاں
کیوں گھروں کے شور سے شرمندہ ہیں بازار بھی

قوم کو تحسینِ فن کا درس دینے کے لیے
فن پہ قرباں ہو گئے شاعر بھی، موسیقار بھی

خواب ہیں عمریں گنوا دینے کے موسم جا چکے
اب نئی نسلیں ہیں کچھ خوابیدہ، کچھ بیدار بھی

اپنی مٹی کی کسوٹی کو کبھی پرکھو ندیم
جسم کے رشتے سے سمجھو روح کے اسرار بھی

دسمبر
۱۹۷۵ء

سنہ ۱۹۷۵ء

اب کے 'بہار' جانے، کہاں پر رُکی رہی
پتّے ہیں گرد گرد تو ڈالیں ہیں خم بہ خم
کلیاں روش روش ہیں کہ کنکر قدم قدم
مٹی ہے ریت ریت تو سبزہ ہے تار تار
جھونکے ہوا کے ہیں کہ بگولے ہیں یم بہ یم
ہر شخص ایک سایہ ہے، ہر چہرہ اک سوال
بچّوں کی طرح لمحے رواں ہیں، بہ چشمِ نم
ہر تازہ پھول میں ہے پھپھوندی لگی ہوئی
اس موسمِ بہار سے پت جھڑ بُری نہ تھی

دسمبر
۱۹۷۵ء

ستارہ شام کا

ستارہ شام کا نکلا
تو پھولوں نے
اڑتی تیرگی میں سر اٹھا کر اس کو دیکھا
اور پھر سرگوشیاں کیں —:
یہ ہماری نسل سے ہے!
آسماں پر موسمِ گُل کا ہرا دل ہے!

۳۱ر دسمبر
۱۹۷۵ء

قطعات

○

جو انقلاب مرے دوستوں کے ذہن میں ہے
وہ تیر ہے، جو کماں چھوڑ کر چلا ہی نہ ہو
یہ کارواں تو عبث رہنما کی کھوج میں ہے
کہ نقش کیسے ملے، جب قدم اُٹھا ہی نہ ہو

○

اگر ہجوم ہو اذہان پر عقائد کا
تو دوپہر کو بھی مدھم دکھائی دیتا ہے
گھنے درخت اگر چھا رہے ہوں چار طرف
تو آسماں بہت کم دکھائی دیتا ہے



ہوا کی نرم خرامی بھی کیا قیامت ہے
کہ اس کی یاد امڈ آئی ہے گھٹا کی طرح
میں اس کو سوچ تو سکتا ہوں، چھو نہیں سکتا
وہ میرے سامنے موجود ہے — خدا کی طرح



بہت عجیب سے لہجے میں تم نے پوچھا ہے
کہ آج کس کے لیے اس قدر اُداس ہو تم؟
میں سوچتا ہوں کہ اک دن جُدا تو ہونا ہے
میں مانتا ہوں کہ اِس وقت میرے پاس ہو تم



اب اور کس کے لیے اہتمامِ رخصت کروں
مرا رفیقِ مسافت تو ہار بیٹھا ہے
کہ اپنے آپ کو اک زحمتِ نظر دے کر
وہ قرض، زندگی بھر کے، اتار بیٹھا ہے



نہیں قبول ادھورا صلہ پرستش کا
بدل نہیں ہیں فرشتے، اگر خدا نہ ملے
میں تیرے شہر میں آیا ہوں اجنبی کی طرح
خدا کرے کہ کوئی صورت آشنا نہ ملے



یوں تو جوہر نے الاؤ سا لگا رکھا ہے
روح سے نور کا احساس چھنا جاتا ہے
صبح ہوتی ہے مگر رات نہیں کٹ پاتی
اب تو سورج بھی ستاروں میں گنا جاتا ہے



بات کہنے کا جو ڈھب ہو، تو ہزاروں باتیں
ایک ہی بات میں کہ جاتے ہیں کہنے والے
لیکن اُن کے لیے ہر بات کا مفہوم ہے ایک
کتنے بے درد ہیں اس شہر کے رہنے والے!



اب ترے پیار میں پہلا سا نہیں اُجلا پن
چاند! پہلی سی وہ ٹھنڈک تری کرنوں میں نہیں
اس لیے میں تجھے کچھ دیر میں پہچان سکا
اب کسی خواب کا کاجل تری آنکھوں میں نہیں



موت ہی موت ہے محیط، مگر
زندگی مسکرائے جاتی ہے
ہر طرف برف ہے، مگر اس پر
دھوپ الاؤ لگائے جاتی ہے



رنگ و حرف و صدا کی دنیا میں
زندگی قتل ہو گئی ہے کہیں
مر گیا لفظ، اُڑ گیا مفہوم
اور آواز کھو گئی ہے کہیں



ظالموں کی یہ عجب منطق ہے
"آسمانوں سے وبال آتے ہیں!"
اپنے اعمال کا سب بارِ گراں
اپنے اللہ پہ ڈال آتے ہیں



چپ تو ہو جاؤں، مگر میرا ضمیر
تیرے احکام کے کہنے میں نہیں
چیخ اُٹھنا بھی تو مجبوری ہے
جبر کچھ ظلم ہی سہنے میں نہیں



یہ دیکھ کے، "رہبرانِ حق" پر
وحشت سی سوار ہو رہی ہے
انسان کی ہو رہی ہے گنتی
عورت بھی شمار ہو رہی ہے



شب مجھے کچھ یوں لگا، جیسے نجوم
خامشی کے حبس سے ڈر جائیں گے
کتنی صدیوں کے خلائی فاصلے
ایک ہی لمحے میں طے کر جائیں گے

رباعیات



ہر زخم میں ڈوب کر ابھرنا ہے مجھے
ہر تجربۂ غم سے گزرنا ہے مجھے
ہر درد کا ذائقہ ہے چکھنا لازم
دستورِ نشاط وضع کرنا ہے مجھے



اے کشتیٔ اعتقاد کھینے والے!
اے درسِ صلوٰۃ و صوم دینے والے!
اک دو تو بجا لاتے خدا کے احکام
لاکھوں ہیں خدا کا نام لینے والے



ملتا جو خدا کہیں، تو اس سے کہتے
تنگ آ گئے ظلمت کے طمانچے سہتے
کاش آج زمیں پہ یوں برستا سورج
رات آتی تو روشنی کے دریا بہتے



قدرت کا دکھا نیا تماشا، یارب!
بس ایک ہی منظر تو نہ دوہرا، یارب!
اب ختم بھی کر گناہِ آدم کی سزا
اب موت کو منسوخ بھی فرما، یارب



انساں میں کیوں زوال پیدا ہوگا
جب روز نیا خیال پیدا ہوگا
جب اس کو ملا سبھی سوالوں کا جواب
اس سے بھی تو اک سوال پیدا ہوگا

متفرق اشعار

تاریخ بکف ہے ذرّہ ذرّہ
صحرا میں کسے کسے صدا دوں

○

یہ نکتہ، ہر حقیقت کی ہے بنیاد — کہ جو موجود ہے، مبہم نہیں ہے

○

صبح کے نور سے بھیگے ہُوئے کھیتوں میں کسان
ہل چلاتے ہیں تو فن کار نظر آتے ہیں

○

خیرات کے لیے مرا دامن بنا نہیں
دامن دریدہ ہوں کہ میں دامن کشاں رہا

○

شاخِ گل، آبِ رواں پر جھک کر — کسی پتّی کا پتہ پوچھتی ہے

○

یاد آئے نہ خال و خد اسی کے — جس شخص کو بے حساب دیکھا

○

میں تمھیں اپنا شاہکار کہوں — میری رعنائی گماں دیکھو

○

اک جہنّم ہے زندگی جن کی — صرف جنّت سے کب بہلتے ہیں

○

اے خدا کوئی آدمی بھی تو بھیج — سب خدا ہیں تری خدائی میں

○

کھُلا، کہ اور ہی تھا میرا منتہائے نظر
میں اُس کو پا کے بھی آمادۂ سفر ہی رہا

○

وہی زخم کی سی رنگت، وہی یاد کی سی نکہت
کوئی میرے دل سے پوچھے، سرِ شاخسار کیا ہے
جسے آشنا بناؤں، ترا عکس اس میں پاؤں
ترے حسنِ بے جہت پر، مرا اختیار کیا ہے

○

صدی صدی میں اک اک پل کٹے تو کون جیے
طویل عمر کا اب حوصلہ کسی میں نہیں
تو پھر یہ زندگی کاہے کو ہے — قیامت ہے
اگر یہ طے ہے کہ تُو میری زندگی میں نہیں

ساحل پر انبوہ کھڑا چلاتا رہا　　اک بچہ دریا میں گر کر ڈوب گیا

○

یہ گھٹائیں ہیں کہ وعدے ہیں تری رحمت کے
گھر کے آئیں، مگر اک پل نہ برسنے پائیں

○

لُٹ گئی فصل تو کھلیان میں کیا باقی ہے
کچھ جو باقی ہے تو ویران ہوا باقی ہے
جشن کی روشنیاں بجھ بھی گئیں تو کیا غم
میری دیوار پہ مٹی کا دیا باقی ہے

○

آج کے دَور کا انساں ہے فقط سوداگر
حسن کا بھاؤ نہ طے ہو تو محبت نہ کرے

○

اور اک بار پکارو، کہ بھری دنیا میں
عین ممکن ہے، کہیں سے کوئی انساں بولے

○

فصیلِ رنگ نے منظر چھپا لیا تھا، مگر
ہوا چلی تو گلستاں کا راز فاش ہُوا

سرِ ہر راہگزر اک فصیل اُبھری ہے　　اور سر پھوڑ کے مرنا مجھے منظور نہیں

○

دیوانہ ہوں میں بھی، کہ نکلتے ہیں یہ ہر لفظ
افکار کے خورشید مرے چاکِ قلم سے

○

ہم بچھڑ کر بھی بچھڑنے نہیں پاتے تجھ سے
تیری یادوں میں ترے قرب کی مہکاریں ہیں

○

عجب حشر اُٹھا خلد میں، جب آدم زاد
بڑھا نقوشِ قدم چھوڑتا خلاؤں میں

○

دل میں یوں اس کے خیال آتے ہیں　　جیسے صحرا میں غزال آتے ہیں

○

ہم جو افلاک پہ پہنچے بھی، تو کیا ہاتھ آیا
ہاں مگر خاک جو چھانی تو خدا ہاتھ آیا

○

مری زندگی میں، یارب! کوئی ایسا پل تو آتا
ترے ابر بھی برستے، مرے بن بھی لہلہاتے

میں تری کھوج میں مبہوت پھرا کرتا ہوں   میں ترے پاس سے گزروں تو صدا دے دینا

○

سو گئے لوگ کہ آزاد ہوئے   کوئی آواز سلاسل میں نہیں

○

کیوں بھولے ہوئے ہیں صدیوں سے، انداز بکھر کر چلنے کا
پیاسے دریاوں کو مژدہ ہو، وقت آ گیا برف پگھلنے کا

○

اپنی نظروں میں بھی ہم اک لفظِ بے مفہوم ہیں
اس نے نہ دیکھا بھی تو کیا، اس نے نہ دیکھا بھی تو کیا

○

یہ اور بات، خدا بھی نہ مجھ کو یاد رہا   تری وفا پہ قیامت کا اعتماد رہا

○

نظر میں شرم ہے، لب نیم وا ہیں، چہرہ گلاب
سحر کی ساری صباحت ترے جمال سی ہے

○

میں فکرِ سخن میں کہاں آ گیا   کہ زیرِ قدم آسماں آ گیا